MAY 2007

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

Reg: CPL No. 80

مئی

2007

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

اللہ

محبت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت [illegible] گوجرانوالہ

منشور دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ؁ ط

الاعراف ۔ 205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے
ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح وشام
یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

ماہنامہ
دعوتِ فلاح
گوجرانوالہ
تعمیرِ محبت اور بنی نوع انسان
کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ**
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 10 شمارہ 8 مئی 2007ء ربیع الثانی 1428ھ

... -/20 روپے ———— سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
...ت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493...

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

...رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

درس قرآن

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ)

سلامتی کی راہ:۔

مگر اس معاشرے میں ایک طبقہ راہِ ہدایت کی جانب انابت و رجوع اللہ کے باعث صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے اور یہ محض فضلِ الٰہی ہے ایسے لوگوں کیلئے انعامات کی بارش برستی ہے۔ اور ان کا خالق انہیں خوشخبری سنا کر دلی سکون اور چین سے نوازتا ہے:۔

وھذا صراط ربك مستقیما ط قد فصلنا الایت لقوم یذکرون o لھم دارالسلم عند ربھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون o

''یہی تمہارے رب کا متعین کردہ سیدھا راستہ ہے جو لوگ غور کرنے والے ہیں، ہم نے اُن کیلئے نشانیاں واضح کر کے بیان کر دی ہیں۔ اُن کیلئے اُن کے اعمال کے بدلے میں (ان کے) رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست ہے''۔ (الانعام:126-127)

اور اس کی مزید تسلی و اطمینان کیلئے ان کے رب نے ان کیلئے واضح علامات متعین کر دی ہیں تا کہ وہ بھٹکنے سے بچ جائیں اور جب اسی راہِ مستقیم پر چلتے چلتے موت سے ہمکنار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو سلامتی اور چین کے گھر میں منتقل کر دیتے ہیں اور راہِ ہدایت سے اعراض کرنے والوں کو اسی مقام پر آگ میں ڈالے جانے کی اطلاع دے دی۔

حشر کا ایک المناک منظر:۔

اور پھر وہ منظر بیان کیا کہ جب یہ بدبخت و نامراد طبقہ جہنم میں اکٹھا ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان سے اتمامِ حجت کے طور پر یہ سوال کریں گے۔

یمعشر الجن والانس الم یاتکم رسل منکم یقصون علیکم ایتی وینذرونکم لقاء یومکم ھذا ط قالوا شھدنا علی انفسنا و غرتھم الدنیا وشھدوا علی انفسھم انھم کانوا کفرین o ذلك ان لم یکن ربك مھلك القری بظلم واھلھا غفلون o ولکل درجت

مما عملواط وما ربك بغافل عما يعملون٥

''اے گروہ جن وانسان! کیاتم میں سے تمہارے طرف رسول نہیں بھیجے گئے جو میری آیات تمہارے سامنے پڑھ کر سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہاں ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔ آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ یہ شہادت ان سے اس لئے لی جائے گی کہ ثابت ہو جائے کہ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جبکہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں''۔ (الانعام: 130-131)

اللہ تعالیٰ کسی قوم یا کسی بستی پر اس وقت تک عذاب نہیں بھیجتا جب تک کہ انہیں پہلے خوب اچھی طرح سے سمجھا نہ دیا جائے، ان میں کوئی نبی نہ بھیج دیا جائے جو انہیں ڈرائے اور سمجھائے اور انہیں جنت کی بشارت دے جب حُجت تمام ہو جائے اور اللہ کا رسول ہر طرح سے ان کو ظلم وشرک، قتل وخون اور دہشت گردی سے روکنے کی بھرپور کوشش کر لے اور وہ باز نہ آئیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب کا کوڑا برستا ہے لیکن اس میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جن ہوں تو انہی میں سے نبی ان کی طرف بھیجا جاتا رہا ہے۔ انسان ہیں تو انسانوں میں سے نبی اور رسول ان کی طرف بھیجا جاتا رہا ہے۔ یہ الگ خصوصیت ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت آفاقی ہے۔ آپ جن وبشر دونوں کیلئے خاتم النبیین ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ اور اہم بات پیش خدمت ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ قرآن مجید اپنے اندر ایک ادبی انداز لئے ہوئے ہے۔ قرآن مجید بعض دفعہ ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ ادیب، شاعر اور سخن ور کے علاوہ ہر ادبی ذوق رکھنے والا شخص پھڑک اٹھتا ہے، اس سلسلے میں پہلے اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ اب ذرا صرف اس کے ترجمہ پر دوبارہ آپ بھی غور فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں سے یوں ارشاد فرمائے گا:۔

''لو اب تم تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔ جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا، وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے ہو اور اب ہم تمہارے ساتھ

تمہارے ان تمام سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رشتے ٹوٹ گئے اور سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے''۔ (الانعام:95)

افسوس کہ یہ ترجمہ ہے' اصل کلام نہیں۔ اگر اصل کلام پر ذرا غور و تدبر کیا جائے اور اس کی باریکی و لطافت میں ڈوب کر اس کی حقیقت تک پہنچا جائے تو انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ اس کلام میں اس قدر زور ہے کہ کیا کہنے۔ یہ بات آگے چل کر بار بار زوردار انداز میں بیان کی گئی ہے۔

ایک جگہ تو یہ فرمایا کہ دنیا لہو و لعب ہے، یہاں کی بادشاہی، وزارت و صدارت ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی تھیٹر میں بادشاہ بن بیٹھے، اس سے بڑا بیوقوف کون ہوگا جو ایسے میں اپنے آپ کو سچ مچ کا بادشاہ سمجھنے لگے۔ یہ عارضی تاج تو چند گھڑیوں کیلئے اس کے سر پر رکھا گیا ہے۔ قیامت میں یہ شکل ہوگی کہ بادشاہ سلامت جب اپنے انجام کو دیکھے گا تو زبان سے کہے گا:۔

''میرا مال میرے کسی کام نہ آیا۔ میری بادشاہت ختم ہوگئی'' تو اوپر سے حکم ہوگا۔

''اس ظالم کو پکڑ کر جکڑ دو اور اس کو جہنم میں ڈال دو۔ یہ اللہ تعالی کے بارے میں دل میں ایمان نہیں رکھتا تھا اور اس نے زندگی بیکار ضائع کر دی''۔

احتساب کا کوئی تصور اُس کے ہاں نہیں تھا۔ آج اس سے حساب کتاب لیا جائے۔

اب آگے چلیں تو ہمیں قرآن مجید فرقانِ حمید اپنا ایک تعارف کراتا نظر آتا ہے:۔

قد جاءکم بصائر من ربکم ط فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها ط وما انا علیکم بحفیظ o (الانعام:104)

''دیکھو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا (انہیں آنکھیں کھول کر پڑھے گا) اس میں اس کا اپنا بھلا ہے اور جو اندھا بنے گا تو اس میں اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ میں تم پر کوئی نگہبان یا پاسباں بنا کے نہیں بھیجا گیا؟

اس آیت کریمہ میں قرآنِ مجید کو بصائر کہا گیا۔ اس میں اہلِ بصیرت کیلئے روشنیاں ہیں اور

جو لوگ قرآن کی آیات میں غور و فکر نہیں کرتے بلکہ اس سے اعراض برتتے ہیں۔تو ان کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا و نحشره یوم القیمة اعمی o قال رب لم حشرتنی اعمی وقد کنت بصیراًo قال کذلك اتتك ایتنا فنسیتها ۔ وکذلك الیوم تنسیo

''اور جس شخص نے میری نصیحت (یعنی قرآن) سے منہ موڑا تو اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اُٹھائیں گے۔وہ کہے گا: اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اُٹھایا، میں تو دیکھتا بھالتا تھا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، تیرے پاس جب ہماری آیات آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا، آج تم کو بھلایا جائے گا''۔

(طٰہٰ:124-126)

یعنی جس شخص نے قرآنِ مجید کو آنکھیں کھول کے نہیں پڑھا اور اس کے نام و پیام کے ساتھ وہ اندھا بن کے رہا تو اس کو اندھا ہی اُٹھایا جائے گا۔جو شخص اللہ تعالیٰ کے پیغام سے منہ موڑے گا، اس کا جینا اس دنیا میں تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو اندھا کر کے اُٹھائیں گے۔

اس سے قبل متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ لفظِ تلاوت کے معانی پیروی (Follow) کرنے کے ہوتے ہیں۔ہمارے ایک پروفیسر کا تکیہ کلام تھا ''Follow Me'' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ اور پیروی (Follow) انسان صرف اسی صورت میں کر سکتا ہے جب بقائمی ہوش و حواس بات کو سمجھ رہا ہو۔قرآنِ مجید وہ کتاب ہے جس کو بقائمی ہوش و حواس سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں مشرکانہ رسوم کی تردید میں جانوروں کی مختلف اقسام اور ان کی حلت و حُرمت کے احکام مذکور ہیں۔

توریت میں احکامِ ربانی:۔

اب ہم ان تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی اُمتوں کیلئے مقرر تھیں اور یہی تعلیمات ہم پر بھی لاگو ہیں:۔

توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیا احکام دیئے تھے؟ اس بارے میں اللہ رب العزت کا ارشادِ مبارک ہے:۔

''اے محمد ﷺ ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تمہارے اوپر کیا پابندیاں عائد کی ہیں''۔

1۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

2۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

3۔اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی دیں گے۔

4۔اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہو یا چھپی ہوئی۔

5۔کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ (عدالتی چارہ جوئی کے بعد) یہ باتیں ہیں جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

6۔اور تم یتیم کے مال کے نزدیک نہ جاؤ مگر اس طرح کہ بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن شعور کو پہنچ جائے۔

7۔اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا کہ اس کے امکان میں ہے۔

8۔اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

9۔اللہ کے عہد کو پورا کرو، اللہ نے تمہیں ان باتوں کی ہدایت کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

10۔یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اسی پہ چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں منتشر کر دیں گے۔یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم تقویٰ اختیار کر سکو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وهذا كتب انزلنه مبرك فاتبعوه واتقوا لعلكم ترحمونo

''یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے ایک برکت والی! پس تم اس کی پیروی کرو، اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے''۔ (الانعام:155)

معلوم ہوا کہ تین چیزوں کا حکم دیا جا رہا ہے:

یعنی قرآن کہتا ہے کہ میرا اتباع کرو، مجھے (Follow) کرو اور فہم، تدبر اور غور و فکر کے ساتھ میری پیروی کرو، فرمایا کہ قرآن پر عمل کر کے دکھاؤ، تقویٰ اختیار کرو، ایسی شکل میں اللہ کی رحمت تم پر نازل ہوگی۔

فرقہ واریت کی مذمت:۔

راقم نے قرآنِ پاک میں ایک بات کا بار بار مشاہدہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید جہاں اپنا ذکر کرتا ہے، اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ فرقہ واریت کی بات بھی کر دیتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو ٹکڑوں میں بٹ جاؤ گے۔

ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

''اللہ کی رسی (قرآنِ مجید) کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بازی میں مت پڑو''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

ان الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا لست منهم في شيء - انما امرهم الى الله ثم ينبئهم بما كانوا يفعلونo

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً اے نبی! ان سے آپ کا کچھ واسطہ نہیں۔ انکا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے؟''۔ (الانعام:159)

یعنی وہ لوگ جو متشابہات میں پڑتے ہیں، فروعی مسائل اُٹھاتے ہیں اور اختلافات میں پڑتے ہیں، حضورِ اکرم ﷺ ان کی شفاعت سے بری ہیں۔ ان لوگوں کا حضور ﷺ سے کوئی تعلق اور نسبت

نہیں اور دوسری بات یہ فرمائی کہ جواللہ کے ہاں نیکی لے کر آئے گا،اس کا دس گنا اجر ہے۔نیکی کا ارادہ کریں تو ایک گنا اجر اور اگر نیکی پر عمل کریں تو دس گنا اجر! اگر غلطی کرے گا تو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔یہ اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔

حقیقی ہدایت

پھر ارشاد فرمایا:۔

قل اِننی ھدنی ربی الی صراط مستقیم ۔ دینًا قیما ملة ابرھیم حنیفا ۔ وکان من المشرکین o

قل ان صلاتی و نسکی و محیای ومماتی للّٰہِ رب العالمین o

لا شریك له ۔ و بذلك اُمرت وانا اول المسلمین o

قل اغیراللّٰہِ ابغنی ربا وھو رب کل شی ءٍ ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وزرۃ وزر اُخری ثم الی ربکم مرجعکم o

"اے محمد (ﷺ) کہو! میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ یا کجی نہیں جسے یکسو ہو کر انہوں نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ کہو میری نماز، میری تمام مراسم عبودیت، میرا جینا، اور میرا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں؟ حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے، وہ خود اس کا ذمہ ذمہ دار ہے۔ کوئی بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف لوٹ کے جاتا ہے۔،، (الانعام: 161-164)

اور وہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا اور ہر شخص اللہ کے حضور تنہا حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جوابدہ ہوگا۔ اے اللہ! ہم سب مسلمانوں کے لئے یہ مرحلہ اپنی رحمت سے آسان فرما۔ آمین!

قندِ مکرر

شکر کی حقیقت

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

بانی سلسلہ نے ہمیں قرآنِ کریم کی باقاعدہ تلاوت اور اس میں تفکر و تدبر کرنے کا جو طریقہ تجویز فرمایا اس پر جو بھائی عمل پیرا ہیں۔ان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بہت ہی کرم ہے اور وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے برابر ترقی کر رہے ہیں۔قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نصیحت حاصل کرنے والوں کیلئے آسان بنایا ہے۔اس میں اپنی الوہیت، واحدانیت اور حاکمیت کے حق میں جو دلائل دیئے ہیں وہ بالکل عام فہم اور بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جانے والے ہیں۔اللہ نے اپنی الوہیت ثابت کرنے کیلئے دقیق قسم کے فلسفیانہ اسرار و غوامض بیان کرنے کی بجائے ان مظاہر فطرت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جن سے ہر کس و ناکس کا ہر روز واسطہ پڑتا ہے اور معمولی سمجھ بوجھ والا انسان بھی سطحی غور و فکر کے نتیجہ میں گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشن شاہراہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ایمان کی طرف رہنمائی کیلئے اللہ بار بار ان نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں جو انسان کی ذات کے اندر ودیعت فرمائیں اور جو خارج میں اس کی زندگی کی ابتدا و بقاء، تعمیر و ترقی فلاح و بہبود اور سہولت و یسرت کیلئے عنایت فرمائیں تاکہ شعوری طور پر ان نعمتوں کا بھی احساس و ادراک ہو جائے اور ہم اللہ کی عطاؤں اور نوازشوں کے دل کی گہرائیوں سے معترف ہو جائیں اور اس کی وسیع رحمت، ان گنت مہربانیوں اور انسانیت کے ساتھ بے پناہ محبت کی قدر جان جائیں۔ اپنے رحیم و کریم آقا کی عنایات میں اپنے آپ کو اس طرح گھرا محسوس کریں کہ دل کی گہرائیوں سے اس کی حمد و ثناء کے سوتے پھوٹ نکلیں۔اس (طرح کی) دلی کیفیت اور احسان شناسی کی روحانی لذت کو شکر کہا جاتا ہے اور حقیقت میں شکر ہی ایمان کا بیج ہے۔اسی سے دل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صحیح قدر و منزلت اور محبت و عظمت پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے۔اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے سورہ الاعراف کی آیت 69 میں حکم صادر فرمایا ہے کہ میری نعمتوں کو یاد کرتے رہا کرو کہ یہی فلاح کی راہ ہے۔

☆**فاذکرو الاء اللّٰہ لعلکم تفلحون**o

ترجمہ! ''اللہ تعالٰی کی نعمتوں کا ذکر کرتے رہا کرو تاکہ تم فلاح پاجاؤ''۔

دوسری جگہ اللہ تعالٰی نے شکر یعنی نعمتوں کی قدرشناسی اور اللہ کا احسان ماننے کو ایمان پر مقدم رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

☆**مایفعل بعذابکم ان شکرتم وامنتم وکان اللّٰہ شاکر علیما**o (النساء147)

ترجمہ! ''اگر تم قدرشناسی کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دیکر کیا کرے گا۔اللہ تو خود قدر پہچاننے والا اور قدر جاننے والا ہے''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالٰی کی نعمتوں کا عرفان ہی ایمان لانے کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں عموماً ''شکر کا لفظ کفر کے مقابلے میں آیا ہے کفر کے لغوی معنی تو چھپانے کے ہیں اور اصلاحی معنوں میں اللہ کی نعمتوں کا اعتراف نہ کرنا ۔ اس کے احسان پر پردہ ڈالنا اور اپنے قول وفعل سے اللہ کی اطاعت نہ کرنا کفر کہلاتا ہے۔المختصر اللہ کی نعمتوں کی قدرشناسی اور اس کی عطاؤں کے لئے احسان مند ہونا شکر ہے اور ناقدرشناسی ہی کفر ہے۔سورۃ لقمان کی آیت ہے۔**ان شکرلی ولوالدیك** اس میں جو حکم ہوا ہے کہ اپنے والدین کا شکر کرو اس کا یہی مطلب ہے کہ دل سے ان کا احسان مان کر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔ان کی خدمت کرو اور ان کے سامنے تواضع کرو۔نہ یہ کہ زبان سے والدین کا شکر ادا کرتے رہا کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان عام طور پر اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدردانی کے معاملہ میں نہایت ہی بےحس اور غافل واقع ہوا ہے۔صرف صحیح قسم کی سوچ اور تربیت کے ذریعہ ہی سے ان نعمتوں کا احساس وعرفان ممکن ہے۔انسان کو جس چیز کا احساس ہی نہ ہو وہ گویا اس کے لئے موجود ہی نہیں۔ایک مادرزاد اندھے کے لئے رنگوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔اسی طرح سماعت سے محروم انسان کے لئے ساز وآواز کی دنیا کالعدم ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک مکمل طور پر بہرہ بچہ آواز سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے بول بھی نہیں سکتا۔کیونکہ جب اسے الفاظ سنائی ہی نہیں دیتے تو وہ ان کی نقل نہ

کر سکنے کی وجہ سے کوئی زبان کس طرح سیکھ سکتا ہے۔حالانکہ اس کے صوتی نظام میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوتی۔اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کے احساس اور قدر شناسی کے باب میں بھی انسان غفلت کی وجہ سے عموماً اندھا اور بہرہ بنا رہتا ہے۔قرآن پاک میں تو آیا ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔جو نعمتیں احاطہ علم میں ہی نہ آ سکیں تو ان کیلئے شکر ادا کرنا۔کیونکر ممکن ہوگا۔لیکن جو نعمتیں انسان کے علم میں آ چکی ہیں ان کی قدر دانی کے معاملے میں بھی وہ بے حس ہو جائے تو ایسے ہی ہے گویا وہ نعمتیں اس کیلئے موجود ہی نہیں۔جب شعور و ادراک کی یہ کیفیت ہو تو انسان اپنے محسن و منعم مولا کا شکر گزار بندہ کیونکر بن سکتا ہے۔اور جب شعور بیدار ہو تو انسان پھلدار ٹہنی کی طرح اللہ کے سامنے جھکتا ہی چلا جاتا ہے۔ایسے انسان کا دل کھانا کھاتے، پانی پیتے، سواری کرتے، مناظر فطرت دیکھتے الغرض ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو محسوس کرتا اور شکر گذاری کے جذبات سے سرشار رہتا ہے۔

حضور افضل البشر حبیب خدا ﷺ جن پر اللہ نے نعمتوں کی تکمیل فرمائی راتوں کو اتنا قیام فرماتے کہ پائے مبارک متورم ہو جاتے۔جب جانثاروں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ آپ اس قدر مشقت کیوں اُٹھاتے ہیں۔تو نعمتوں کا شعور رکھنے والی سرکار نے فرمایا۔کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ **سبحان اللّٰہ الصلوٰۃ والسلام علی حبیب اللّٰہ** انسان کی بے حسی اور غفلت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ رحیم و کریم نے محض اپنے فضل و کرم سے جو ان گنت نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔انہیں ہم اپنی پیدائش کے وقت سے مسلسل دیکھتے آنے کی وجہ سے ان کے عادی ہو جاتے ہیں اور غلط فہمی کی بناء پر ہم انہیں معمول کے مطابق ملنے والا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری خیال نہیں کرتے۔انسان اگر اپنے جسم پر ہی غور کرے تو اس کا ہر عضو خدائی صنعت کا عجوبہ اور قدرت کا کرشمہ ہے۔جس کی قیمت ادا ہی نہیں کی جا سکتی۔اللہ نے جو بے شمار صلاحیتیں اور ظاہری و باطنی حواس انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ان کا احسان چکایا ہی نہیں جا سکتا۔

اس طرح خارج میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کی تخلیق، موسموں کا تغیر و تبدل، کرہ

ارض پر پانی کا نزول اور اس کے ذریعے مردہ زمین پر حیات کی ابتدا، انواع و اقسام کے غلوں اور پھلوں کی پیدائش، مویشیوں کی سواریاں اور ان کے دودھ اور گوشت، کھالوں، بالوں اور ان کا استعمال اور ان کے علاوہ لکھوکھا عوامل کی ایک خاص ترکیب کے ساتھ موجودگی جن کے بغیر کرہ خاک پر زندگی کا وجود اور تفصیل ممکن ہی نہیں تھا۔ ان کے ہم اس طرح عادی ہو چکے ہیں۔ کہ انہیں ہم خدائے قدوس کی بخشش، عطا اور عنایت سمجھنے کی بجائے قانون فطرت یا کسی اور خوشنما اصطلاح کا نام دیکر غیر شعوری طور پر کفران نعمت اور کفر منعم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں کی قدر شناسی اور احسان فراموشی سب سے بنیادی شیطانی پھندا اور ہمہ جہتی حملہ ہے۔ اس لئے اس کھلے دشمن نے اللہ کے سامنے روز ازل ہی سے یہ اعلان کر دیا کہ جسطرح میں ناشکری کی وجہ سے مردود ہوا ہوں اسی طرح یہ ہتھیار اولاد آدم پر آزما کر اسے بھی شکر گذاری کی راہ سے ہٹا دونگا۔ جب شکر کی روش کو ترک کر دے گا تو صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا۔

قال فبما اغویتنی لا قعدن لھم صراطك المستقیم ۔ ثم لا تینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ۔ ولا تجد اکثرھم شکرین (الاعراف 16-17)

ترجمہ! "شیطان نے کہا کہ جس بات سے تو نے مجھے گمراہ کیا میں بھی ان کیلئے تیرے راستے پر گھات لگاؤں گا پھر میں ان کے آگے پیچھے، دائیں اور بائیں سے حملہ آور ہونگا۔ اور تو ان سے اکثریت کو شکر کرنیوالے نہیں پاؤ گے"۔

ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ آدم کو تو نے مٹی سے بنایا اور مجھے آگ سے اور آگ مٹی سے بہتر ہے۔ یہ ابلیس کی کج فہمی اور بنیادی خطا تھی کہ اس نے اللہ کی عطا کو اپنا کمال خیال کیا۔ اس کی تخلیق آگ سے کی گئی تو یہ اللہ کی عنایت تھی لیکن اس نے اسے اپنی ذاتی فضیلت جان کر تکبر کیا۔ تو راندہ درگاہ ہو گیا اور اس طرح قارون نے اپنے مال و دولت کی فراوانی کا سبب اللہ کے فضل کی بجائے اپنے علم و ہنر کو گردانا تو عذاب میں ماخوذ ہوا۔ اللہ کی عنایات کو اپنی ذاتی کوشش سے منسوب کرنا بھی ناشکری اور

کفرانِ نعمت ہے اور اس سے عقیدے اور عمل کی بے شمار خرابیاں جنم لیتی ہیں۔

بابا گورو نانک جی نے رزق کے معاملے میں انسانی سوچ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا۔

دتا کھاویں رب دا تے آکھیں کھاناں کھٹ

ایسے گلوں نانکا ہویں چوڑ چپٹ

(کھاتے تو رب کا دیا ہوا ہو اور کہتے ہو کہ خود کما کر کھاتا ہوں۔ اسی بات نے اے نانک تمہیں برباد کر ڈالا ہے)

برادرانِ کرام! قرآن پاک کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اندازِ دعوت یہ ہے کہ وہ اپنی عطا کردہ نعمتوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ انداز بدل بدل کر تکرار کرتے اور انسانی ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں تا کہ وہ عہدِ الست کو یاد کر کے بیدار ہو جائے۔

☆ **یایها الانسان ماغرك بربك الكريم**

ترجمہ! ''اے انسان اپنے رب کریم سے تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے''۔

تم اپنی ذات کے اندر اور اپنے اردگرد رونما ہونے والے مظاہرِ فطرت پر کیوں تدبر نہیں کرتے۔ اگر ایسا کرو تو تمہارا ضمیر پکار اٹھے گا کہ ساری کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے۔ اس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ وزیر نہ مشیر وہ اکیلا ہے اور اس کے سوا کوئی ہستی بندگی کے لائق نہیں ہے۔

قرآن کی دعوتِ فکر اور استدلال کا انداز سمجھنے کیلئے چند آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

☆ تمہیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح کا پیدا کیا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے اوپر تلے سات آسمان بنائے اور چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ ٹھہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین (مٹی) سے پیدا کیا ہے۔ پھر اسی میں لوٹا دیتا ہے اور اس میں سے تم کو نکال کر کھڑا کرے گا۔ اللہ ہی نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا تا کہ اس کے کشادہ راستوں پر چلے پھرو۔ (نوح۔13 تا 20)

☆ ہم نے تم کو پیدا کیا تو تم اقرار کیوں نہیں کرتے دیکھو تو جس قطرہ کو تم ڈال دیتے ہو کیا تم اس سے انسان بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔ (الواقعہ 57 تا 59)

☆ بھلا دیکھوتو جو کچھ تم بوتے ہوتو کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ۔ (الواقعہ 63 تا 65)

☆ بھلا دیکھوتو جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے یا ہم اتارنے والے ہیں اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ (الواقعہ 68 تا 70)

☆ بھلا دیکھوتو جو آگ تم جلاتے ہو اس کے درخت تم نے پیدا کئے ہیں یا ہم پیدا کرتے ہیں۔ (الواقعہ 71 تا 72)

☆ اگر اللہ قیامت کے دن تک رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تم کو روشنی لا دے کیا تم سنتے نہیں اور اگر اللہ قیامت تک دن ہی رہنے دیں تو اللہ کے سوا کون معبود ہے۔ جو رات لا دے۔ جس میں تم آرام کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو۔ تاکہ اس کا احسان مانو یعنی شکر گزاری کرو۔ (القصص 71 تا 73)

☆ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے پر غور کرے کہ یہ کیسے تیار ہوا۔ اس کیلئے ہم ہی نے پانی برسایا۔ ہم ہی نے زمین اور چارہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چار پایوں کیلئے بنایا۔

(عبس 24 تا 32)

☆ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنا دیا بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ یہی تمہارا پروردگار ہے جو ہر چیز کا خالق ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں پھر تم کہاں بھٹک رہے ہو۔ (المومن 61 تا 62)

☆ ان کیلئے ایک نشانی مردہ زمین ہے۔ جسے ہم نے زندہ کیا اور پھر اس میں سے اناج اُگایا۔ اور اسی میں سے یہ کھاتے ہیں اور اس میں سے کھجوریں اور انگوروں کے باغات پیدا کئے اور اس میں چشمے جاری کیے ہیں۔ تاکہ یہ ان کے پھل کھائیں اور ان کے ہاتھوں نے تو ان کو نہیں بنایا پھر یہ شکر کیوں نہیں کرتے۔ (یٰسین 33 تا 73)

☆ کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا کو جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے ان کیلئے بنائی ہیں۔ ان میں چار پائے ہیں جن کے مالک یہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کو ان کے قابو کر دیا۔ تو اب کوئی

ان کی سواری ہے اور کسی کو یہ کھاتے ہیں اور ان میں ان کیلئے دیگر فائدے ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں۔تو یہ شکر کیوں نہیں کرتے۔ (یٰسین 71 تا 73)

☆تمہارے لئے کشتیاں اور چارپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہوتا کہ ان کی پیٹھ پر چڑھ سکو۔جب اس پر سوار ہو جاؤ تو اپنے پروردگار کا احسان یاد کیا کرو اور یوں کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارے زیر فرمان کر دیا اور ہم میں طاقت نہ تھی کہ اس کو بس میں کر لیتے اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں۔(الزخرف 13 تا 14)

☆اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا تو تم کچھ جانتے تھے۔اس نے تمہارے لئے حصول علم کے ذرائع، کان، آنکھیں اور دماغ بنائے تا کہ تم احسان مانو اور شکر گزاری کرو۔(النحل آیت 78)

☆اے اہل ایمان جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں انہیں کھاؤ اور اگر اللہ کے بندے ہو تو اس کا شکر بھی ادا کرو۔(البقرہ۔172)

الغرض اللہ تعالیٰ نہایت ہی آسان الفاظ اور دل میں اُتر جانیوالے پیرائے میں انسان کو دعوت فکر دیتا ہے تا کہ اس کی شکر گزاری کے احساس میں شدت پیدا ہو جائے اگر ہم خدا کی دوسری مخلوق پر غور کریں تو اس میں سے کئی ایک آنکھوں سے محروم ہیں اور کئی ایک کان نہیں رکھتے۔اور لاکھوں کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض زمین پر رینگ کر زندگی گزارتے ہیں اور ہزاروں چارپاؤں پر چلتے ہیں۔اللہ نے انہیں نطق سے محروم رکھا ہے۔کہ مافی الضمیر کا اظہار نہیں کر سکتے۔خوشی میں ہنس اور غمی میں رو نہیں سکتے۔ان کے مقابلے میں اپنے اعضاء اور حواس پر غور کریں اور منعم حقیقی کی سپاس گذاری کریں۔جانوروں اور اپنی خوراک کا موازنہ کریں اور اللہ کی حمد و ثناء کریں کہ کیسی کیسی لاتعداد اور نفیس، پاک صاف، خوش رنگ، خوش ذائقہ اور خوشبودار اشیا انسان کے لئے پیدا فرمائیں اور ہمیں مختلف ذائقوں، رنگوں، خوشبوؤں اور آرزؤں سے لطف اندوز ہونے کے لئے خاص قسم کے حواس عطا فرمائے۔**تبارك الله احسن الخالقين** (اللہ تعالیٰ نے کس قدر درست ارشاد فرمایا ہے۔کہ **ولقد كرمنا بني ادم** یعنی ہم نے

اولادِ آدم کو عزت عطا فرمائی ہے۔اگر ہم ذرا سا بھی غور کریں تو ساری مخلوقات کے مقابلے میں لباس ،خوراک، رہن سہن الغرض ہر میدان میں اللہ کے دیئے ہوئے اس اکرام اورفضیلت کو محسوس کریں گے۔خدا کی ساری مخلوق اپنے پاؤں پر چلتی یا پروں کے سہارے اڑتی ہے۔جنگل کا بادشاہ بھی پیدل ہی چلتا ہے ۔اور پرندوں کے شہنشاہ کو بھی سواری میسر نہیں ۔لیکن انسان کو سواری کے لئے جانور مسخر کر دیئے اور وہ سمجھ بوجھ عطا کی جس کے بل بوتے پر اس نے بحر و بر اور فضا میں سفر کے لئے تیز رفتار مشینیں ایجاد کر لیں ۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محض اپنے کرم سے انسان سے زیادہ طاقت ور عظیم وجسیم جانور حضرت انسان کی سواری اور دیگر فوائد کے لئے مسخر کر دیئے۔اللہ ہی نے پانی کو یہ فطرت عطاء فرمائی کہ اس میں کشتیاں اور بڑے بڑے وزنی جہاز تیر سکیں ۔ہوا کو وہ خاصیت عطا کی کہ اس میں عظیم الجثہ ہوائی جہازوں کا وزن سہارنے کی قوت ہے ۔سطح زمین کے نیچے انسان کے استعمال کیلئے تیل کا ذخیرہ پیدا فرما کر محفوظ کر دیا۔اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی اور نت نئے تجربات کر کے اختراعات اور ایجادات کرنے کے قابل بنایا۔جو لوگ قوانین فطرت کے مطالعہ اور تحقیق وتفتیش میں مصروف ہر وقت انسانیت کی بہتری کے لیے سوچتے رہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی رہنمائی اور مدد فرماتے ہیں نئے اور اچھوتے خیالات ان کے ذہنوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔اسی لئے اللہ تعالیٰ کشتیوں اور دوسری سواریوں کی تخلیق کو اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں ۔حالانکہ یہ بظاہر انسانی غوروفکر اور تجربات کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہیں ۔سورہ یاسین میں آیت 40-41 میں ارشاد ہوتا ہے کہ ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔کشتی کے علاوہ دوسری سواریاں جو موجودہ دور عالم وجود میں آ چکی ہیں ۔وہ تو سب کو معلوم ہیں اور آنے والے ادوار میں اللہ جانے کیسے کیسے عجوبے ظاہر ہونگے ۔

قرآن پاک میں ایک جگہ یہ بھی آیا ہے کہ اللہ نے تمہیں پیدا فرمایا اور جو کچھ تم بناتے ہو اسے بھی ۔یعنی ہماری ایجادات اور مصنوعات بھی حقیقتاً اللہ ہی کی تخلیق ہیں ۔اسی لئے سواری پر بیٹھتے

وقت پڑھنے کے لئے یہ دعا تعلیم فرمائی۔ **سبحان الذی سخرلناھذاوما کنالہ مقرنین۔۔۔** الخ

ترجمہ! یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کردیا۔ ورنہ ہم میں طاقت نہ تھی کہ اسے بس میں کرلیتے۔ اگر آپ قرآن کریم کا غور سے مطالعہ کریں تو یہ بات واضح اور اظہر من الشمس ہوتی چلی جائے گی کہ اللہ تعالٰی چاہتے ہیں کہ انسان کو اس کی عطا کردہ نعمتوں کا ادراک واحساس ہوجائے اور وہ اپنے منعم اور محسن کی قدر پہچان کر اس کے بھیجے ہوئے رسول ﷺ کی اطاعت میں داخل ہوکر مسلم کہلوانے کا اعزاز حاصل کرکے فلاح دارین کا حقدار بن جائے۔ اولادآدم سے ایسی ہی بندگی درکار ہے جو اللہ کی نعمتوں کا کامل شعور رکھتے ہوئے شکر وسپاس کے جذبے سے معمور دل اور اللہ کی عظمت وکبریائی اور اس کی معرفت اور محبت کے نشہ سے چور روح کے ساتھ ادا کی جائے نہ کہ نباتات وجمادات کی طرح وہ تسبیح جو کائنات کا ذرہ ذرہ طوعاً کرھاً کررہا ہے۔ کیونکہ انسان پر اطاعت کی راہ جبراً مسلط نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ فرمایا گیا کہ۔

انا ھدینہ السبیل اماشاکراواماکفورا۔ (الدھر۔۳)

ترجمہ! ''ہم نے اسے راستہ بتادیا ہے اب چاہے شکر گزار بنے یا ناشکرا''۔

انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ دوراہوں میں سے جو راہ چاہے اختیار کرلے۔ چاہے تو احسان فراموشی، قدر ناشناسی اور کفران نعمت کا وطیرہ اختیار کرکے عذاب کا مستحق بن جائے۔ اور چاہے تو اللہ کی نعمتوں کی قدر شناسی کرتے ہوئے اور اس کا احسان مانتے ہوئے کامل شعور کے ساتھ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجائے۔ بقول اقبالؒ

وہی سجدہ ہے لائق احترام
کہ ہو جس سے ہرسجدہ تجھ پر حرام
یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اگرچہ شکر یا کفر کی راہ کے انتخاب کا اختیار انسان کو سونپا گیا ہے۔ پھر بھی اللہ تعالٰی جس پر

ہمیشہ رحمت کا غلبہ رہتا ہے ۔اسے مغفرت اور جنت کی راہ کی طرف پکارتا رہتا ہے ۔انسان اگر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس کا سارا وجود ،وجود کی ہر حرکت ،دل کی ہر دھڑکن ،سانس کی آمدورفت،خوراک کا ہر لقمہ،پانی کا ہر گھونٹ ،زندگی میں میسر ہر نعمت اور سہولت اللہ رحیم وکریم ہی کی عطا ہے ۔اور شکر کی متقاضی ہے ۔حقیقی شکر یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے اپنے خالق و مالک کی حمدوثناء کرکے اوران گنت نعمتوں سے نوازنے والے رحیم کریم آقا کی مکمل اطاعت اور حضور نبی کریم ﷺ کی کامل اتباع میں زندگی بسر کرے ۔کیونکہ یہی راہ نجات ہے ۔

ومن شکرفانمایشکرلنفسہ۔ومن کفر فان ربی غنی کریم

''اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے کرتا ہے اور جو ناشکری یعنی کفر کرتا ہے تو میرا پروردگار بے پرواہ اور عزت والا ہے''۔ (النحل۔40)

کیونکہ شکر ہی سے ایمان وعمل میں نکھار پیدا ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور جو ناشکری یعنی کفر کی راہ اختیار کرلیتا ہے اس کے لئے تنگی کا جینا اور مرنے کے بعد جہنم میں ٹھکانا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد رکھیں کہ اگر تم شکر کرو گے تو ہم تمہیں نعمتیں دیں گے اور اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بڑا سخت ہے''(ابراہیم۔7.14)

اسی طرح ایک مشہور ومعروف آیت میں حکم دیا گیا ہے

☆۔فاذکرونی اذکروکم واشکرولی ولاتکفرون

ترجمہ!''تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا اور میرا شکر کرتے رہو اور کفر ہرگز نہ کرنا''۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہی شکر کی تاکید کی گئی ہے اور شکر کی ضد سے بچنے کو کہا گیا ہے ۔غالباً''اس ہدایت پر عمل کرنے کے لئے ہی نبی کریم ﷺ نے جو دعا تعلیم فرمائی وہ تحفہ خاص ہے اور اسے ہر نماز کے بعد پڑھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے ۔

اللھم اعنی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک

''یا اللہ اپنے ذکر،اپنے شکر اور اپنی احسن بندگی کے لئے میری مدد فرما''

خواجہؒ کے خطوط

(خالد مسعود توحیدی)

1۔نقصان ہو جائے گا

(بنام محمد مرتضٰی صاحب11-8-1963)

''پچھلے ماہ صرف کورنگی اور ڈرگ روڈ کا چندہ آیا تھا۔باقی ملیر، لانڈھی ملیر کینٹ، کراچی اور ماڑی پور کا بالکل نہیں آیا۔یوسف شریف نے تین ماہ سے چندہ نہیں بھیجا۔ان سے کہیں کہ ایسا نہ کیا کریں۔میں کہاں تک سمجھاؤں جب نقصان ہو جائے گا تو سمجھ میں آئے گا''۔

2۔سالانہ کنونشن

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب18-3-1963)

''کنونشن کے بارے میں یہ طے ہوا ہے کہ جو لوگ شریک ہوں وہ کچھ نہ کچھ مالی مدد ضرور کریں جو پانچ روپے فی آدمی سے کم نہ ہو۔جو زیادہ دے اللہ اس کو زیادہ دیگا۔آپ کنونشن کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا شکریہ۔کاش سب خادمان حلقہ ایسے ہی Prompt اور Well-Disciplined ہوتے تو آج حلقہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہوتا۔جو اپنا فرض ادا کرتے رہتے ہیں ان کی آزمائش اللہ نہیں کرتا۔حلقہ فنڈ کے خرچ کا پورا حساب چھپوایا جا رہا ہے۔کنونشن میں سب کو ایک کاپی دی جائے گی اور اس پر باقاعدہ رپورٹ بھی سنائی جائے گی۔آپ لوگوں کا پیسہ میرے ہاتھوں میں بالکل محفوظ ہے اور بہترین جگہ پر خرچ ہوتا ہے''۔

3۔کامیابی کا گر

(بنام ولی محمد صاحب16-2-1964)

''کوئی بھی کام ہو اس میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ مستعدی سے ان قاعدوں کے بالکل مطابق کیا جائے جو اس کام کیلئے مقرر ہیں''۔

4۔ مفت کتابیں

(بنام محمد قاسم صاحب 7-2-1964)

''آپ کی دو کتابیں مجھ کو مفت مل گئیں ۔ آپ کو مجھ سے بھی قیمت لینی چاہئے ۔ مفت کسی کو نہ دیں''۔

5۔ ڈسپلن کی پابندی

(بنام محمد قاسم صاحب 10-6-1964)

''مرتضٰی صاحب سے بعد سلام کہہ دینا کہ آپ نے ملازمت چھوڑنا اور در در کی ٹھوکریں کھانا تو پسند کر لیا لیکن شریفوں کی طرح رہنا، فرض اور ڈیوٹی ادا کرنا اور ڈسپلن کا پابند رہنا پسند نہیں کیا۔ جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز ہے اور جو حلقۂ توحیدیہ کے قانون میں خاص طور پر ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ افسوس ہے ان کی سمجھ پر''۔

6۔ حق پر محبت کو قربان کر دو

(بنام محمد مرتضٰی صاحب 16-10-1965)

''میں بخدا اپنے سب مریدوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں لیکن فرائض کی پابندی نہ ہو اور ڈسپلن کا خیال نہ کیا جائے تو میں محبت کی پرواہ نہیں کرتا ۔ آپ بھی آئندہ یہ بات یاد رکھیں کہ حلقہ والے اس آخری فقرے یعنی ''حق پر محبت کو قربان کر دو'' بھول گئے ہیں، اس لئے سست اور کم عمل ہو گئے ہیں ۔ جب میرے اتنے سے حکم کی تعمیل نہیں ہوتی تو کل کو اگر خدا کے نام پر مال و جان قربان کرنے کی ضرورت پڑے تو کون سنے گا''۔

7۔فرائض منصبی

(بنام محمد مرتضٰی صاحب16-10-1965)

''مجھے ملنے کی ایسی ضرورت نہیں ۔فرائض منصبی بخوشی وشوق اور پورے ولولے سے پورا کرنے کی ضرورت ہے ۔

8۔شادی کی مٹھائی

(بنام محمد صدیق ڈار18-5-1960)

''ان سے (بھٹی صاحب سے)شادی کی مٹھائی او رحلقہ فنڈضرور وصول کریں ۔اورجن لوگوں کےذمہ جنوری سےاب تک بقایاہوان سے پورا وصول کریں''۔

عروج کیسے ممکن ہے؟

(عبدالقیوم ہاشمی)

اللہ تعالیٰ نے جب یہ عظیم منصوبہ یعنی کائنات کی تخلیق کی اور جن و انس اور دیگر بے شمار مخلوقات کو پیدا فرمایا تو ہر ایک مخلوق پہ کچھ ذمہ داریاں عائد کیں جو اُس مخلوق کی تخلیق کا مقصد پورا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جن و انس کے سوا اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اللہ کی مطیع و فرمانبردار ہے یعنی مسلم ہیں۔ اللہ سبحانہ نے اپنی حکمت کے تحت جن و انس کو آزمانے کیلئے اللہ کے صراطِ مستقیم پہ چلنے یا اُس سے دور ہٹنے کا پورا اختیار دیا۔ اس دنیا کو انسانوں کی عارضی قیامگاہ بنا کر تمام انسانیت کو یہ موقع فراہم کر دیا تاکہ وہ اس زندگی سے اپنی خوبیوں خامیوں کا معائنہ کرتے ہوئے فہم و فراست کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔

الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاًo

(اللہ) جس نے موت و حیات کی تخلیق اس لئے کی تاکہ جانچ لے کہ کون نیک عمل کرتا ہے۔ (سورۂ ملک)

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی اور فلاح کیلئے وحی یعنی کلام باری تعالیٰ اور انبیاء و مرسلین کا سلسلہ جاری فرما کر بندے اور رب تعالیٰ کے باہمی تعلق کو واضح فرما دیا۔ مطلب یہ کہ توحید اور انسانیت کے باہمی رشتہ کو سمجھنے سے ہی انسانیت کی اصلاح و فلاح ممکن ہے۔ تمام انبیائے کرام کی تعلیمات کا نچوڑ اور محور توحید ہی رہا ہے۔ یہ عقیدہ جو نوع انساں کیلئے سب سے زیادہ اہم تھا انسانیت نے سب سے زیادہ ٹھوکریں بھی اسی میں کھائیں ہیں۔ یہودیوں نے اللہ کی ذات کو صرف یہودیوں تک محدود سمجھ کر باقی انسانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا، اس لئے اللہ کی نظر میں مغضوب ٹھہرے اور انسانیت کیلئے مجموعی طور پر ضرر رساں ثابت ہوئے۔

عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ ٹھہرایا اور صریح شرک کے مرتکب ہوئے لہٰذا دونوں گروہین کی وجہ سے انسانوں کا ایک بڑا طبقہ اللہ کی ذات سے درست آشنائی پیدا کرنے سے محروم رہ گیا یعنی جو خود اللہ کی راہ سے بھٹک گیا وہ راہِ خدا کیسے دکھا سکتا ہے۔

وما قدر الله حق قدرہo

(اور اللہ کی قدر نہ جانی جیسی اللہ کی قدر کرنی چاہیے تھی)

مسلمانوں میں توحید کے حوالے سے اگر جائزہ لیا جائے، انفرادی اور اجتماعی طور پہ عقیدہ توحید سے آگے ہماری روزمرہ کی زندگی میں عملی لحاظ سے توحید کی تعلیم بالکل غائب ہے۔توکل علی اللہ، محبت الٰہی، صبر و شکر اور اللہ سے استعانت کا درس منبر و محراب اور سکول و کالج سے سنائی نہیں دیتا۔لہٰذا عملی زندگی میں مسلمان بالخصوص پاکستانی مسلمانوں میں پست فکری کا پیدا ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔تعلیم توحید کے ذریعے ہی اعلیٰ اخلاقی قدریں پروان چڑھ سکتی ہیں۔رسول کریم ﷺ نے فرمایا **تخلقوا باخلاق اللہ** (اللہ تعالیٰ جیسے اخلاق پیدا کرو) قرآن کریم میں ارشادی باری تعالیٰ ہے کہ انسانوں کو اللہ نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ''**صبغت اللہ**'' (یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو) لہٰذا قرآن و سنت کے مطابق جب ہم تعلق باللہ کو اپنی زندگیوں میں عملی طور پہ شامل کریں گے تبھی اعلیٰ روحانی و اخلاقی قدروں کا معاشرہ میں فروغ ممکن ہے۔بنی نوع انسان کی ابتدائی زندگی توحید پر مبنی تھی حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کی ہی بندگی اختیار کی۔جب انسانیت کا قافلہ آگے بڑھا تو نفس پرستی نے اپنے رنگ دکھائے اور انسانی برادری توحید کی تعلیم سے دور ہٹتی گئی۔جب اجتماعی انسانی شعور نے ترقی کی تو نفس پرستی کی جگہ قبیلہ پرستی نے لے لی مزید فکری ارتقا ہوا تو قبیلہ پرستی سے وطن پرستی یا قوم پرستی تک پہنچ گئے حتیٰ کہ ترقی کرتے ہوئے نظریہ کمیوزم تک انسانیت آ پہنچی بلاشبہ یہ سب کچھ انسانیت کی بھلائی کیلئے سوچا گیا اور لاکھوں لوگوں نے اس کیلئے جانیں بھی دیں۔کیونکہ یہ تمام انسانی قدم توحید کی تعلیم سے خالی تھے لہٰذا انسانیت کی تعمیر میں کوئی اہم کردار ادا نہ کر سکے۔آنحضورؐ نے فرمایا **الخلق عیال اللہ** (یعنی تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) اس لئے اللہ کی ہدایات کے بغیر انسانیت تنہا فلاح کے راستے پر ہرگز نہیں چل سکتی لہٰذا جب تک انسانیت رب کائنات اور رب الناس کو اپنا مقصود و مطلوب اور محبوب نہ ٹھہرائے گی فلاح حقیقی اور انسانیت کو عروج و ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔

آج کے مسلمان اگر یہ خیال کرتے ہیں کہ توحید کو صرف عقیدے کی حد تک مان لینے سے

مسلمان عروج حاصل کر لیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے اگر تعلیم توحید اور علم و اخلاق میں پیش رفت نہ کی تو نشاۃ ثانیہ ایک لاحاصل خواہش اور محض خواب کی صورت ہی اختیار کرے گا۔ اگر چہ مثبت سوچ اور خوش گمانی کوئی بری بات نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں رہنے اور عروج و زوال کے کچھ قانون قاعدے بنائے ہیں جن سے کسی کو مفر نہیں۔

آپ لاکھ خواہش یا دُعا کریں کہ رات بارہ بجے سورج طلوع ہو جائے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جس طرح آم کے درخت پہ پھل کیلئے چار پانچ سال محنت اور صبر درکار ہوتا ہے اور جسطرح ایک انجینئر یا ڈاکٹر بننے کیلئے سولہ سترہ برس محنت، وقت اور پیسہ صرف کرتا ہے تب کہیں جا کر وہ اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کیلئے عروج و ترقی کا جذبہ تو ایک قابل قدر بات ہے لیکن عملاً اگر مسلمان خالص توحید اور عمل و اخلاق اور علم و تحقیق کو اپنی زندگی میں شامل ہی نہ کریں تو عروج کے متعلق سوچنا تو درکنار اپنی پستی اور غلامی سے باہر نکل آنا بھی عجوبہ ہوگا۔

اب پاکستان کی مجموعی حالت کا جائزہ لے لیجئے۔ خونی رشتوں میں اتنی دوری پیدا ہو چکی ہے کہ عزیز و اقرباء اور ہمسائیوں سے اچھے تعلقات قائم رکھنا بہت بعد کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارا معاشرہ اسی وجہ سے انتشار و افتراق، بدامنی و بے یقینی اور بے اخوتی کا نظارہ پیش کر رہا ہے۔ باہمی محبت، خلوص، تعاون، مروت پرانے دور کے قصے کہانیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت پورے ملک کے کاروبار میں بے ایمانی، عدالتوں میں ناانصافی اور ملازمتوں میں رشوت ستانی نے ملکی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ دنیا کے 166 ممالک میں پاکستان 144 واں کرپٹ ترین ملک ہے۔ لہٰذا ان حالات کے پیش نظر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستانی معاشرہ زبردست انتشار کا شکار ہے اخلاقی و روحانی قدروں کو تو ایک طرف رہنے دیں، مسلمہ انسانی بنیادی اخلاقی قدریں بھی پامال ہو چکی ہیں۔ ایسی صورت حال کے مطابق اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے سیاسی رہنما، مشائخ و علماء ناکام ہو چکے ہیں تو غلط نہ ہوگا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان معززین کے اہداف میں توحید و اخلاق اور علم و تحقیق سرے سے داخل ہی نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں فلاحی ریاست کا حصول ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ علماء کی جانب سے اتحاد کی

بجائے فرقہ بندی، مشائخ کے ہاں سے سیرت اور کردار سازی کی بجائے زندگی گریز موشگافیاں اور سیاستدانوں سے جمہوری قدروں اور انصاف کی بجائے آمریت پسندی کے تعفن نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اللہ کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو قوم اخلاقی پستی کا شکار ہو جائے وہ تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے قرآن کریم میں ہر قوم کی تباہی کی وجہ اخلاقی پستی ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ محض قوانین کے ذریعے ایک قوم کو اصلاحی معاشرہ میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا قوانین کا نفاذ اس وقت ہوتا ہے جب جرائم کا ارتکاب ہو جاتا ہے مطلب یہ کہ قوانین صرف اُس وقت حرکت میں آتے ہیں جب فساد فی الارض یا کسی کی جان، مال، آبرو پہ ضرب آجائے۔ جرم کے ارتکاب سے پہلے مجرم کا ذہن اور اخلاق پہلے ہی تباہ ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی اقدار کے زوال ہی سے جرائم جنم لیتے ہیں۔ اس لئے ہمارے مقتدر حضرات کا پہلا فرض یہ بنتا ہے کہ توحید و اخلاق اور علم و تحقیق کو معاشرہ میں فروغ دیا جائے۔

اس سلسلہ میں حکومت کا اولین فرض ہے کہ وہ دوہرے معیار تعلیم کو ختم کر کے یکساں نصاب تعلیم رائج کرے جسکے ذریعے سے توحید و اخلاق اور علم و تحقیق پر مبنی تعلیم نوجوان نسل کو فراہم کی جا سکے۔ قرآن اور سائنس و ٹیکنالوجی سے متعلقہ علوم کو خصوصی فروغ اور توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ عمرانیات، سیاسیات، نفسیات اور معاشیات جیسے علمی شعبوں کو بھی ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو اور TV چینلوں جن میں انفارمیشن اور منفی پروپیگنڈا کے بے ہنگم رخ کو بدل کر قوم کو ایجوکیٹ کرنے کی طرف موڑ دیا جائے یہ بھی آج کے دور میں بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان ہی ثقافتی یلغار کا شکار ہیں۔ اور اسے روکنا ممکن ہے اگر ہمارے تعلیمی ادارے اور ہمارے چینل قرآن کریم کیمطابق سیرت و اخلاق اور علم و تحقیق سے قوم کی تربیت کریں گے تو پھر اعلیٰ کردار مسلمان اور محقق اس ملک میں پیدا ہونگے اور ان پہ نہ تو غیر اسلامی ثقافت اثر انداز ہوگی اور نہ ہی غیر اسلامی نظریات اثر کریں گے بلکہ ایسے صاحب کردار مسلم محققین کا اثر اُلٹا دیگر ثقافتوں پہ پڑنا شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ جب معاشرہ کا فرد توحید کے رنگ میں رنگا جائے گا تو یقیناً اخلاق، کردار، سیرت اور فکر انتہائی بلند سطح پہ پہنچ جائے گا اور جس

میدان میں بھی کام کرے گا اسے کمال درجہ تک پہنچائے گا اور اسکا ماحول بھی متاثر ہو کر رہے گا۔مخیّر حضرات،علماء ومشائخ اور حضرات سیاست واقتدار جوالیکشن اور افطار پارٹیوں وغیرہ کے موقع پہ اربوں روپے صرف کر دیتے ہیں اگر یہی رقم تعلیمی اداروں کے قیام کیلئے صرف کر دیں جہاں تو حیدو اخلاق اور سیرت وکردار سازی اور تحقیقی علوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہو تو یقیناً فلاحی معاشرہ کا قیام حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔لہٰذا سب کام چھوڑ کر پہلے قوم میں ایسے تعلیمی اداروں کو عام کرنے میں ہمارے طبقہء اعلیٰ کو اپنی تمام توانائیاں صرف کر دینی چاہیں اس طرح سے ہی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جانب بڑھا جا سکتا ہے ورنہ مسلمان جسطرح پہلے اپنی ناکامیوں پہ پردہ ڈالتے ہوئے مہدی ومسیح کا انتظار کرتے کرتے ملک عدم روانہ ہو گے موجودہ مسلمان بھی دور زوال ،پستی اور غلامی کا مشاہدہ کرتے ہوئے اسی امید اور بہلاوائے دل کے ساتھ قبروں میں پہنچ جائیں گے۔اور اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی بھی مشکل ہو جائے گی ۔مختصر یہ کہ عروج اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے علماء،صلحاو مشائخ اور مقتدر قوتیں متحد ہو کر تعلق باللہ پر مشتمل تعلیم کی ترویج کریں اور قرآن وسنت کی رہنمائی میں معاشرہ کو فلاحی معاشرہ بنا دیں ۔یہ بہت ہی صبر آزما کام اور نصب العین ہے اور اسمیں کوئی شارٹ کٹ بھی نہیں ہیں لہٰذا منزل مقصود کا تعین درست ہونا چاہیے اسکے حصول میں خواہ نسل در نسل قربانیاں ہی کیوں نہ دینی پڑیں ۔**وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا لْبَلَاغُ الْمُبِيْن**o

وصف الکبر

(پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ)

میں نے عرض کی کہ اس تکبر کی کیا کیفیت ہے جو ریا کاری سے پیدا ہوتا ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ اس کی صورت یہ ہے کہ حق بات کو اس شخص پر پلٹ دے جو حق بات کو نظیریں دے کر بیان کر رہا ہو۔ یا کوئی اس کو حکم دیتا ہو اگر چہ وہ اس سے کم یا اس سے بہتر ہو مگر اس کا مطمع نظر حق کو رد کرنے میں یہ ہوتا ہے کہ مبادا میری غلطی پکڑ لی جائے تو میرا مرتبہ کم ہو جائے گا، یا کہیں یہ نہ کہا جائے کہ فلاں شخص مجھ پر غالب آ گیا۔ تو ریا کاری اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ تکبر کے اخلاق اختیار کرے، اگر چہ وہ اپنے دل میں یہ جانتا ہو کہ جس شخص نے مجھ سے مناظرہ کیا ہے یعنی نظیریں دے کر بات کی ہے یا کوئی حکم دیا ہے ممکن ہے وہ مجھ سے بہتر ہی ہو لیکن وہ نفرت اور غلبۂ ریا کاری کے طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے دل سے بڑائی کے طریق پر نہیں ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ وہ کونسی شکل ہے جس میں کینہ بڑائی (تکبر) کی شان پیدا کر دے؟ فرمایا کہ وہ صورت یہ ہے کہ جس شخص سے آدمی کینہ رکھتا ہے ہو اس بناء پر کہ مثلاً اس نے ظلم کیا یا برا بھلا کہا ہے یا جھگڑا کیا ہے تو وہ اس بات میں تکبر کرتا ہے تو اسے سلام کرنے سے بچتا ہے۔ اور موقع ملنے پر اس کے حق کو بھی رد کر دیتا ہے اور اس کا سبب کینہ ہوتا ہے کہ مبادا لوگ یہ کہیں کہ اُس نے اس کی بات مان لی یا یہ کہیں کہ اُس نے اسے پہلے سلام کر لیا تو عداوت اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ حق کو رد کرنے میں تکبر کا اظہار کرے۔ پس کبھی ریاء اور کینے سے بھی تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ شخص اپنے دل میں جانتا ہوتا ہے کہ میں اُن سے دراصل کمتر ہوں۔

صرف خود پسندی ہی ایسی صفت ہے جس میں تکبر قلبی ہوتا ہے۔ تو یہ شخص دوسروں سے ناک بھوں چڑھا کر بات کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں ہر اُس شخص سے بہتر ہوں جس کے پاس وہ خوبی نہیں ہے جو میرے پاس ہے اور یہ کیفیت دین و دنیا اور علم و عمل سب باتوں کو شامل ہے۔ تو جہاں ایسا شخص دوسروں پر کسی نعمت یا خوبی میں بڑھ جائے گا وہیں عُجب و تکبر کا اظہار کرے گا۔ یہ اس کی طبعی جہالت ہو گی اور اس طرح وہ شکر کے مواقع کھو دے گا۔ اسی لئے عابد لوگ اپنے بارے میں

اس بات سے مطمئن نہیں ہوتے کیونکہ خودپسندی، عُجب اور تکبر نعمتوں ہی کے راستے سے آتا ہے۔ جب نعمت کثیر اور عظیم ہوتی ہے تو عُجب اور تکبر بہت تیزی سے آتا ہے۔ خصوصاً ان خوبیوں کی وجہ سے جو عوام پر ظاہر ہو جائیں خواہ ان کا تعلق علم سے ہو یا عمل سے، دونوں صورتوں میں تکبر بہت تیزی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔

اِسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح یہ بات وہاں بھی پیدا ہو جاتی ہے جہاں لباس میں نمائش ہو۔ مثلاً کسی شخص نے صوف کا لباس پہن لیا ہوا اور وہ اس شخص پر فخر کرنے لگے جو اس لباس میں نہ ہو۔ اسی لئے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ صوف کا لباس پہنتے ہیں ان میں ان لوگوں سے بھی زیادہ تکبر آ جاتا ہے جو ریشم کا لباس پہنتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے سچ فرمائی کیونکہ ریشم پہننے والا جس بڑائی کا اظہار کرتا ہے وہ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اس کے پیشِ نظر صرف اہلِ دنیا ہی کے مقابلے میں اپنی بڑائی ہوتی ہے اور وہ شخص اہلِ دین کے مقابلے میں جھکتا ہے۔ لیکن جو شخص صوف کا لباس پہنتا ہے، کبھی کبھی اس کے دل میں ریشم کا لباس پہننے والے کو دیکھ کر یہ خیال آ سکتا ہے کہ میں دین کے لحاظ سے، اُس سے برتر ہوں اور ریشم پہننے والا جب اس کو دیکھے گا تو اپنے اوپر اس کی فضیلت کا قائل ہو جائے گا اور اپنے کو ذلیل سمجھے گا جس کا سبب صالحین کا لباس اور زہد فی الدنیا کے آثار ہوں گے۔

پس خودپسندی اور تکبر ایسے عیب ہیں کہ کوئی صاحبِ عقل کسی حالت میں بھی ان کی طرف سے ایمن نہیں ہو سکتا۔ ہر اُس بات سے جس کی وجہ سے انسان دوسرے سے نمایاں طور پر برتر معلوم ہونے لگے، اس میں فتنہ اور ابتلا تیزی سے آنے لگتا ہے۔ اسی بناء پر جب تمیم الداریؓ نے سیدنا حضرت عمرؓ سے وعظ کہنے کی اجازت چاہی تو آپ (رضی اللہ عنہ) نے انکار فرما دیا اور کہا کہ تم ذبح ہو جاؤ گے (یعنی کبر میں مبتلا ہو جاؤ گے)۔ اسی طرح ایک شخص نے سیدنا موصوفؓ سے کہا کہ میں اپنی قوم کا امام ہوں اس لئے مجھے نمازوں کے بعد تذکیر و دعا کی اجازت دی جائے تو آپ (رضی اللہ تعالیٰ) نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہیں تم اتنے نہ پھول جاؤ کہ تمہارا سر ثریا سے جا

لگے۔بات یہی تھی کہ آپ کو اس شخص کے متعلق تکبر کا خدشہ پیدا ہوا۔حضرت حذیفہؓ نے ایک دن نماز پڑھانے کے بعد لوگوں سے کہا کہ تم اپنے لئے دوسرا امام منتخب کر لو یا الگ الگ نماز پڑھ لو۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی تو کہا میرے دل میں یہ خیال آ گیا تھا کہ آج میری قوم میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔

پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی خصوصی نعمت کسی دوسرے پر ظاہر بھی ہو جائے اور ان میں کبر پیدا نہ ہو۔صرف وہی شخص اس بلا سے محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا اپنا فضل نازل کر دے اور اسے صحیح راستے پر چلائے۔پس اللہ ہی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنا چاہیے۔

میں نے عرض کی کہ آپ نے کبر فی الدین کا بیان تو کر دیا، اب یہ بھی بتائیے کہ کبر فی الدنیا کیا ہوتا ہے؟فرمایا کبر فی الدنیا یہ ہے کہ حسب ونسب، جمال، طاقت، مال، اور اولاد کی کثرت ہو تو انسان کے دل میں کبر پیدا ہو جاتا ہے، اگر حسب ونسب ارفع ہو تو انسان حسب ونسب میں کمتر لوگوں کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے چاہے اعمال کے لحاظ سے وہ اس سے برتر ہی کیوں نہ ہوں۔بعض لوگوں کو حسب ونسب کا غرور اتنا مغرور کر دیتا ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ عوام ان کے غلام ہیں، اس لئے وہ ان لوگوں سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے۔جب ان سے ملتے ہیں تو ان پر اپنا فخر جتاتے ہیں اور غصے کے وقت انہیں عار دلاتے ہیں۔

سیدنا ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے سامنے میں نے ایک شخص سے تیز کلامی کی اور میں نے اسے ''**یا ابن سوداء**''(اے کالی عورت کے بیٹے) کہہ کر خطاب کیا۔ یہ سن کر حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اے ابوذر! زیادتی مت کرو، زیادتی مت کرو۔کسی سفید نسل کے آدمی کو کسی سیاہ نسل کے آدمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے''۔ابو ذرؓ کی زبان سے یہ جملہ اس لیے نکلا تھا کہ اس شخص کی ماں کالی تھی اور ان کی ماں گوری تھی۔پس انہوں نے اپنے آپ کو اس شخص سے بہتر سمجھا۔ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی زبان سے جملہ سن کر میں زمین پر لیٹ گیا اور میں نے اس شخص سے کہا کہ کھڑے ہو کر اپنا پاؤں میرے رخسار پر رکھ دو تا کہ میرا نفس ذلیل ہو جائے اور میری اصلاح ہو جائے۔

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایک صالح آدمی کو بھی پیش آ سکتی ہے خصوصاً جب کہ وہ غصے کی حالت میں ہو۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس بات سے غیبت بھی ہو جاتی ہے مثلاً کسی نے دوسرے سے کہا کہ فلاں شخص تو کوزی یا سندی یا نبطی ہے اور اس سے اس کی مراد اس شخص کی تنقیص ہو۔ اور کبھی کبھی ان کلمات سے فخر و عار دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میں تجھ سے بہتر ہوں۔ میں فلاں ہوں اور تو کون ہے، تیرا باپ کون ہے؟ کبھی کہتا ہے کہ تیری یہ جرأت کہ تو مجھ سے بات کرے۔ کبھی کہتا ہے کہ تجھ جیسا آدمی مجھے گھور کر دیکھے۔ کبھی کہتا ہے کہ تو اور میری برابری کرے!

اسی قبیل سے یہ واقعہ بھی ہے کہ دو آدمی حضور انورﷺ کے سامنے فخر کی باتیں کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں، میرے سامنے تیری کیا حقیقت ہے؟ تیری تو ماں کا بھی پتہ نہیں ہے کہ کون تھی۔ یہ سن کر حضورﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو آدمیوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے مفاخرت شروع کی۔ ایک نے کہا کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں اور یہ کہہ کر اپنی نو پشتیں گنا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر وحی بھیجی کہ آپ اس شخص سے کہہ دیجئے کہ جن نو آدمیوں کا تو نے ذکر کیا ہے وہ سب جہنمی ہیں پس تو نے ان پر فخر کیا جو دوزخی ہیں (یہ تو کوئی فخر کی بات نہ ہوئی۔

اِسی قبیل سے جناب رسول اللہﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ لوگوں کو اپنے اُن باپ دادوں پر فخر ہر گز نہیں کرنا چاہیے جو جہنم کا ایندھن بن گئے ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نجاست کے ان کیڑوں سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے جو ہر وقت اپنی ناک سے گندگی ہی سونگھتے رہتے ہیں، اور اپنے منہ سے غلاظت ہی چکھتے رہتے ہیں۔ اور اسی قبیل سے حضور انورﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے (از راہ کرم) تم سے زمانہ جاہلیت کی خود پسندی دور فرما دی ہے اس لیے اب تم ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر مت کیا کرو۔

اسی طرح تکبر بالجمال ہوتا ہے کہ انسان اپنے حسن ظاہری پر دوسروں کے مقابلے میں فخر کرتا ہے اور جو لوگ بدصورت ہیں ان کو حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے۔ ان کی برائی بیان کرتا ہے، ان کی

کمزوریاں گنا تا ہے۔اوراسی قبیل سے یہ روایت ہے کہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ ایک دن ایک عورت حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی ۔اسے دیکھ کر میں نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ پستہ قد ہے۔حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہؓ تم نے اس عورت کی غیبت کی ہے (قارئین آنحضرت ﷺ کی ژرف نگاہی اور طرزتربیت پرغور کریں)۔

اسی طرح طاقت جسمانی کی بناپر بعض لوگ ضعیفوں کوحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اوران کی کمزوری پرانہیں عاردلاتے ہیں (مثلاً کہتے ہیں کہ تم آدمی ہویا مچھر)اوران کے مقابلے میں اپنی طاقت پرفخر کرتے ہیں اوراپنی درازیِ قد کا اظہار کرتے ہیں۔

اسی طرح مال کی بناپر بعض لوگ تکبر کا اظہار کرتے ہیں ۔وہ اپنی دولت کی بے جا نمائش کرتے ہیں،اعلیٰ لباس پہن کراکڑتے ہیں ۔اپنے اموال پرفخر کرتے ہیں،دوسروں کوعاردلاتے ہیں اوراس بات پر پھولے نہیں سماتے کہ ہمارا لباس سب سے اچھا ہے ۔اسی قبیل سے یہ واقعہ ہے جو حق تعالیٰ نے قارون کے متعلق ارشاد فرمایا:

''فخرج علی قومه فی زینته ط قال الذین یریدون الحیوة الدنیایلیت لنا مثل ما اُوتی قارون۔(۷۹:۲۸)

پس وہ لباس فاخرہ پہن کر اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا ۔اسے دیکھ کراُن لوگوں نے جو دنیاوی زندگی کے طالب ہیں،کہا کاش ہمیں بھی وہ سب کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔

اسی طرح،انسان اپنی اولاد،خدام اوراہل خاندان کی کثرت پرفخر کرتا ہے اورتکبر کا اظہار کرتا ہے اور مفلسوں ، بےاولادوں اور غریبوں کوحقارت کی نظر سے دیکھتا ہے ۔اس مفاخرت سے خود پسندی پیدا ہوتی ہے اوراس سے کبر پیدا ہو جاتا ہے۔

میں نے عرض کی کہ آپ جن چیزوں کو عُجب اورخود پسندی کہتے ہیں ان ہی کو تکبر بھی کہتے ہیں تو ان دونوں میں دین اور دنیا کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟انہوں نے جواب دیا کہ دین میں تو یہ ہے کہ کبھی بندہ اپنے عمل کو پسند کرتا ہے تو اپنی تعریف کرنے لگتا ہے اور خدا کے احسانات کو بھول

جا تا ہے لیکن انسانوں کے مقابلے میں اپنی بڑائی اور برتری کا خیال دل میں نہیں لاتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود پسندی اسے اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنے لگتا ہے اور ان کو حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس صورت میں وہ متکبر بھی ہوگیا اور مُعجب (خود پسند) بھی ہوگیا۔

رہا دنیا کا معاملہ تو اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے حسن و جمال، مال، اولاد، خدم و حشم، حسب و نسب اور جسمانی طاقت کو دیکھ کر خوش ہو مگر دوسروں کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا اظہار نہ کرے۔ لیکن یہ صورت بہت کم پائی جاتی ہے کہ دنیوی اعتبار سے عُجب (خود پسندی) تو آئے مگر تکبر نہ آئے۔ ایک دفعہ حضور انورﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی دو چادروں میں اکڑتا پھر رہا تھا اور اسے اپنا آپ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس روایت میں حضور انورﷺ نے اس کے تبختر (اکڑفوں) کو عُجب (خود پسندی) سے تعبیر فرمایا۔

غرض متکبر فی الدین ہو یا متکبر فی الدنیا بعض ایسی عادتیں اس شخص میں آ جاتی ہیں جس کو باری تعالیٰ پسند نہیں فرماتے۔ مثلاً علو (سرداری) کی محبت، سخن پروری، اپنی بات کی پچ، معمولی آدمی کی سچی بات کو (بھی) قبول نہ کرنا، اپنے سے کمتر درجے کے آدمیوں سے حقارت آمیز لہجے میں گفتگو کرنا، ان کی جانب بنظر حقارت دیکھنا، ان کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ کرنا اور ان کو حقیر سمجھ کر ملنا وغیرہ۔

علامہ اقبالؒ اور عالم اسلام کا اتحاد

(ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی)

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کی عظیم ملی خواہش، جس کی خاطر انہوں نے ہمیشہ بھرپور جدوجہد کی تھی کہ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

سید جمال الدین افغانیؒ کی طرح علامہ محمد اقبالؒ کا نظریہ بھی یہی تھا کہ روئے زمین کے تمام مسلمان ایک وسیع تر نظریہ قومیت کے حامل ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد توحید ہے، جس کی پاسبانی کی خاطر پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ نے تمام مسلمانوں کو ایک متحدہ قوم بلکہ جسد واحد بنا دیا تھا۔ دنیا کی دیگر اقوام اگرچہ اپنی جغرافیائی نسبتوں کے باعث پہچانی جاتی ہیں اور یہی ان کی شناخت کا ذریعہ ہیں، لیکن مسلمانوں کی شناخت صرف اور صرف ان کا نظریہ اسلام ہے، جس کی خاطر وہ دنیا میں زندہ رہتے ہیں اور مرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے یہی نظریہ اپنے عہد کے مسلمانوں کو ذہن نشین کراتے ہوئے کہا تھا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

علامہ ''ملت از وطن است'' کے بجائے خالص اسلامی نظریہ ''ملت از دین است'' کے مبلغ تھے۔ ان کے نزدیک مصر میں رہنے والے مصری نہیں ہیں، ایران میں رہنے والے ایرانی نہیں ہیں، عرب میں رہنے والے عربی نہیں ہیں بلکہ یہ سب کے سب ''قوم رسول ہاشمی'' کے افراد ہیں۔

اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے

یہی وہ خالص اسلامی فکر ہے، جس کے باعث دنیا بھر کے مسلمان ایک متحدہ قوم اور ایک عظیم قوت بنتے ہیں۔ اس فکر کے مطابق تمام عالم اسلام ایک جسد واحد کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح پاؤں میں کانٹا چبھنے کی تکلیف انسان کا دل محسوس کرتا ہے اور اس کی آنکھ میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو تو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسی طرح روئے زمین پر اگر کسی جگہ بھی مسلمانوں کو تکلیف پہنچے تو اس کی تکلیف پورے عالم اسلام کو ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ جسد واحد ہے اگر وہ یہ تکلیف محسوس نہیں کرتا، تو یہ بات اسلامی اخوت کے سراسر منافی ہے اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایسے معاشرے میں رہنے والے نام نہاد مسلمان اسلام کی روح سے بیگانہ ہیں۔ علامہ کے نزدیک زوال وانتشار کی یہ موجود صورت حال پیدا کرنے میں مغربی حکماء کا بڑا حصہ ہے۔ جن کی مسلسل سازشوں سے مسلمانوں کا یہ نظریہ اخوت مضمحل ہوگیا ہے۔ علامہ مسلمانوں کو سازش سے خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ ہندی وہ خراسانی ، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہوجا
تو ابھی رہگور میں ہے، قید مقام سے گزر
مصر وحجاز سے گزر، پارس وشام سے گزر

علامہ کے نزدیک ہر وہ شخص جو دل سے توحید ورسالت کا اقرار کرلیتا ہے، وہ ایک ایسی عظیم ملت کا فرد بن جاتا ہے جس میں رنگ، وطن، نسل اور قوم کی کوئی تفریق نہیں۔ وہ کالا ہو یا گورا، عربی ہو یا عجمی، امریکہ کا رہنے والا ہو یا جنوب کا، حصار اسلام میں داخل ہوجانے کے بعد اس کی نظر میں جغرافیائی حدود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، وہ ان تمام قیود وحدود سے رہائی پالیتا ہے۔ اسلام کی برکت سے اس کے قلب ونظر میں بے کراں وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہی وہ وسعت تھی، جس کا باعث عرب سے ایک نوجوان محمد بن قاسم ایک مسلمان قیدی عورت کی فریاد پر لشکر جرار لیکر

سندھ پہنچ گیا تھا اور یہی وہ روح تھی جس کی بدولت افغانستان سے احمد شاہ ابدالی، شاہ ولی اللہ کا خط ملتے ہی پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا تھا۔غور کریں تو ہمارے دورعروج کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

اس نظریہ اسلام پر ایمان لانے کے بعد جب حضرت سیدنا سلمان فارسیؓ سے کسی قریش نے ان کا نسب پوچھا تھا،تو انہوں نے فرمایا تھا،"میرا امام ہے، سلمان بن اسلام"یعنی اسلام کا بیٹا ہوں۔دولت اسلام سے مشرف ہونے کے بعد اب "فارس" سے نسبت میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔میرے لئے شرف کا باعث اگر کچھ ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کی روح بھی یہی ہے کہ مسلمان سن آف دی سوئل نہیں بلکہ سن آف اسلام ہے نظریہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اگر کوئی وطن کو اپنا الٰہ بناتا ہے تو وہ اسلام کے نظریہ توحید سے سراسر بیگانہ ہے اس لئے کہ:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اسکا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

عالم اسلام کے ہر مسلمان کیلئے علامہ کا پیغام یہ تھا کہ:

نہ تو زمیں کیلئے ہے، نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کیلئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحر بے کراں کے لئے

☆☆☆☆

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا ہے دلی، نہ صفاہاں ، نہ سمرقند

☆☆☆☆

بتان رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

نہ ایرانی رہے باقی، نہ تورانی، نہ افغانی

☆☆☆☆

جو کرے گا امتیاز رنگ و خون مٹ جائے گا

ترک خرگاہی ہو، یا اعرابی والا گہر

ایک مقام پر علامہؒ اقبال مسلمانوں کو مغرب کے تصور وطن کا فرق یوں ذہن نشین کراتے ہیں۔

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

حضرت علامہؒ نے اپنی عمر کے آخری دور میں (بستر علالت سے) تین معرکہ آرا لڑائیاں لڑی تھیں، پہلی لڑائی قادیانیت کے خلاف، جس کے بانی مرزا قادیانی کے ذریعے استعمار نے جہاد کو متروک قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ دوسری لڑائی کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کے خلاف تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی نے جب کانگرس کے پلیٹ فارم سے یہ کہا کہ

''قومیں اوطان سے بنتی ہیں، تو علامہ اقبالؒ نے ان کے جواب میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ ﷺ کے ہم قوموں کو آپ ﷺ سے پرخاش کیوں ہوتی؟ کیوں رسول اللہ ﷺ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم ابوجہل اور ابولہب کو اپنا نہ بنایا، اور کیوں نہ ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطن قائم رکھی۔ اگر اسلام سے متعلق آزادی مراد تھی، تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کے پیش نظر بھی تھا۔ حضور رسالت مآب ﷺ کیلئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ﷺ ابولہب، ابوجہل یا کفار مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر، جو ہمارے اور تمہارے درمیان ہے، ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے''۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ راہ اختیار نہیں فرمائی۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے ان کا سگا چچا (ابولہب) ان کی قومیت سے خارج ہو گیا۔ اور حبش کا بلال اور

روم کا صہیب (بدیسی ہونے کے باوجود) ان کی قومیت میں شامل ہو گئے۔

علامہؒ جانتے تھے کہ وطنیت کا یہ بت مغرب کے سنگ سازوں نے تراشا ہے۔استعماری قوتیں مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ان کی قوت کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔چنانچہ انہوں نے پوری قوت سے آواز بلند کی کہ عصر حاضر کے مسلمان بت شکنی کا فریضہ انجام دینے کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں اور وطنیت کے اس کے بت کو پاش پاش کر دیں۔

یہ بات کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنے کی اس استعماری سازش کو حضرت علامہ اقبالؒ نے بروقت فاش کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ: ''یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کیلئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت سیاسی تصور کے یک جاہ ہو سکتے ہیں تو میں سب مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ لادینی ہوگا۔اگر لادینی نہیں ،تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سی بے پروائی ہوگی''۔(مولانا مدنی کے جواب میں بیان)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلام ایک پرائیویٹ معاملہ نہیں بلکہ ایک سوسائٹی ہے۔21مارچ 1932ء کو لاہور میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے فرمایا:''میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ معاملہ یا رائے نہیں بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے۔ میں یورپ کی وطنیت کا مخالف ہوں۔اس لئے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں نشوونما پانے کا

موقع ملے تو مسلمانوں کے مادی فوائد کم ہوں گے۔ میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں۔ جو میرے نزدیک انسانیت کیلئے ایک عظیم خطرہ ہے۔ حب الوطنی بالکل ایک طبعی صفت ہے اور انسانوں کی اخلاقی زندگی میں اس کیلئے پوری جگہ ہے۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایت کو حاصل ہے اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان ان کیلئے زندہ رہے اور ان ہی کیلئے زندہ رہے اور ان ہی کیلئے مرے، نہ کہ زمین کے اس ٹکڑے کیلئے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے''۔

جس طرح سورج مشرق سے طلوع ہونے اور مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کے باوجود مشرقی اور مغربی نہیں، اسی طرح ایک مسلمان کسی خطہ زمین سے طلوع ہونے کے باوجود اپنی فطرت کے اعتبار سے ''خاوری'' ہے۔ اسلام نے اسے ایک لازوال عالمگیر رشتہ اخوت سے منسلک کردیا ہے۔ اس نظریہ کو علامہ نے بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔

باوطن اہل وطن را نسبتے است
زاں کہ از خاکش طلوع ملتے است
اندر ایں نسبت اگر داری نظر
نکتہ بینی زمو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے تاب است از سوز دروں
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

(جاوید نامہ: ص68-69)

1930ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں اسی بات پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

''جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص روح کارفرما ہے۔میرا مطلب، یہ ہے کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین وارشادات کی رہین منت ہے، جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں''۔

ملت مسلم کی اساس اسلام ہے جو توحید و رسالت پر مبنی ہے اس کے اجزائے ترکیبی میں وطن کا مغربی تصور شامل نہیں۔ ممکن ہے یہاں کسی ذہن میں سوال اُبھرے کہ جب مسلمانوں کا ایک ملت ہونا ثابت ہے تو اس ملت کا وطن کہاں ہے؟ تو اس کا جواب وہ حدیث رسول ﷺ ہے جس میں ارشاد فرمایا کہ ساری روئے زمین میری مسجد ہے۔علامہ نے اسی حدیث نبوی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے:۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اکیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی استعماری قوتیں مسلمانوں کو ان کی اصل راہ سے ہٹانے کیلئے ایک بار پھر کمر بستہ ہوگئی ہیں تہذیبوں کی اس موجودہ جنگ میں اب ہر مصطفوی کا قدم اس جانب اٹھنا چاہئے جو اسے اس کی منزل (یعنی اتحاد اسلامی) سے قریب تر کردے۔اس لئے کہ اتحاد اسلامی ہی ہماری اصل قوت ہے۔عصر حاضر میں ہمارے لئے علامہ کا یہی پیغام ہے کہ:۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

حرب اسلامی اور دفاع پاکستان

(کرنل فضل ربی)

غزوہ اُحد (شوال ۳ھ)

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ

(اے نبی ﷺ) جب آپ (ﷺ) صبح سویرے اپنے گھر سے نکل کر مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں لڑنے کے لئے بٹھا رہے تھے۔ (القرآن 121:3)

قریش کو جنگ بدر ۲ھ میں نہایت ذلت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شکست کے دن سے کئی سرداروں نے بدلہ لینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ لہٰذا بہت پہلے تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ جنگ بدر کے موقع پر ابوسفیان کے قافلے کے منافع کو جنگی تیاری پر لگا دیا گیا۔ جذبات بڑھانے کے لئے عورتوں اور شاعروں کو تیار کیا گیا۔ جنہوں نے اپنے اشعار اور نغموں سے قریش کو انتقام کے لیے اکسایا قریش نے اپنے حلیف قبائل کو بھی اعانت کی درخواست کی اور یوں شوال ۳ھ میں اٹھائیس سو پیادہ اور دو سو، سواروں پر مشتمل یہ لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں مکہ سے مدینہ چل پڑا۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب جو ابھی تک مکہ میں تھے فوراً ایک تیز رفتار قاصد کو نبی کریم ﷺ کی طرف اطلاع کی غرض سے بھیجا۔ نبی کریم ﷺ کے حضرت حباب بن منذرؓ نے بھی قریشی لشکر کی تصدیق کی۔ اس دوران قریش کی فوج جبل عینین تک پہنچ چکی تھی۔ جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مشاورت طلب کی بدری صحابہؓ کی اکثریت کا خیال تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن شہادت کے متمنی نوجوان صحابہ کرامؓ اور وہ صحابہ کرامؓ جو غزوہ بدر میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے۔ کا اصرار تھا کہ مدینہ سے نکل کر دشمن سے دو دو ہاتھ کئے جائیں۔ دونوں آراء معلوم کر کے نبی کریم ﷺ گھر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر کوچ کا حکم دیا۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک ہزار کا لشکر تھا۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی طرف سے دیئے گئے مشورے پر عمل نہ کرنے کا بہانہ بنا کر تین سو ساتھیوں سمیت نبی کریم ﷺ کے حکم سے مقام شوط سے واپس ہوا۔ جیسے ارشاد ربانی ہے۔

وَقِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوِادۡفَعُوۡا ۔ قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعۡنٰكُمۡ o (القرآن 3:167)

جن سے کہا گیا کہ آؤ راہِ خدا میں جنگ کرو یا کافروں کو ہٹاؤ تو وہ کہنے لگے کہ اگر ہم لڑائی جانتے تو ضرور ساتھ دیتے۔

اگلے دن فجر کی نماز سے قبل سات سو صحابہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ آگے بڑھے اور اُحد کے جنوب مغربی کونے میں کی لشکر سے چھ سو گز دور بالکل سامنے پوزیشن سنبھال لی۔ پچاس تیر اندازوں کو جبل رماۃ پر عقب سے متوقع حملے کی باعث تعینات کیا۔

صبح سویرے تین ہزار اور سات سو کا باقاعدہ مقابلہ ہوا۔ دو چار گھنٹوں کی مزاحمت کے بعد قریش پسپا ہو گئے۔ یہ لڑائی کا پہلا مرحلہ تھا۔ درے پر مقرر تیر اندازوں کی اجتہادی خطا کی وجہ سے لڑائی کے دوسرے مرحلے میں مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا۔ ستر مسلمان شہید ہوئے خود نبی کریم ﷺ کو چوٹیں آئیں اور دندان مبارک شہید ہوئے۔ کفار کے بائیس آدمی مارے گئے۔ تاریخ اور سیر کی کتب میں مقتولین قریش کی تعداد یہی بتائی گئی مگر اصل تعداد کچھ زیادہ ہے جس کی دلیل قرآنی آیت سے واضح ہے۔

اَوَلَمَّا اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مثلیها

ترجمہ! کیا جب تم پر کوئی مصیبت آ پڑے حالانکہ اس سے دو چند مصیبت (بدر اور اُحد کے دن) تم بھی اُن کو پہنچا چکے تھے۔ (القرآن 3:165)

نبی کریم ﷺ نے بحیثیت سپہ سالار غزوہ اُحد میں مندرجہ ذیل دفاعی اُمور اختیار فرمائے۔

دفاع مدینہ کی خاطر مدینہ سے خروج غزوہ اُحد کے موقع پر مدینہ سے نکل کر لڑائی لڑنے اور مدینہ میں رہ کر دشمن کے مقابلے کی تجویز پر اختلاف کا ذکر کیا گیا ہے بعض ماہرین کے نزدیک نبی کریم ﷺ مدینہ میں رہ کر لڑنا چاہتے تھے۔ مگر نوجوان صحابہ کرامؓ جو غزوہ بدر میں نہیں جا سکے تھے۔ کے اصرار پر نبی کریم ﷺ نے زرہ پہن کر مدینہ سے باہر اُحد کے مقام پر دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہ آراء اپنی جگہ لیکن تاریخی حقائق کا بغور جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میدانِ جنگ کا انتخاب خود کیا تھا اس لیے کہ اگر نبی

کریم ﷺ مدینہ میں رہ کر جنگ لڑتے تو صورت حال کچھ اس طرح ہوتی ۔

O چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کی مدد سے گھات لگا کر دشمن کو روکتے جو ناممکن تھا۔ اس لیے کہ دشمن کی تعداد زیادہ تھی ۔ اور نقصان اٹھا کر بھی دشمن کی فوج لڑائی کے قابل رہتی ۔ اس لیے ضروری تھا کہ نبی کریم ﷺ اپنی مرضی کے میدان میں دشمن کو لاکر تیز اور فیصلہ کن حملے میں اسے مکہ لوٹنے پر مجبور کرتے ۔

O مدینہ کے اندر رہ کر مدینہ کے دفاع میں منافقین اور یہود نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہتے جو قابل اعتماد (TRUST WORTHY) نہ تھے اگر نبی کریم ﷺ انہیں مدینہ سے نکالتے تو دشمن کے ساتھ مل کر باقاعدہ نبی کریم ﷺ کا مقابلہ کرتے اور اگر انہیں اندر رہنے دیتے تو یہ بات خطرے سے خالی نہ تھی ۔ شاید منافقین کا سردار اس لیے مدینہ کے اندر رہنے پر مُصر تھا تا کہ اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائے ۔

O اگر سات سو یا ہزار سپاہ سے مدینے کی دفاع ممکن ہوتی تو غزوہ احزاب (۵ھ) میں نبی کریم ﷺ تین ہزار کے لشکر کے ہوتے ہوئے خندق نہ کھدواتے ۔

یہودیوں اور منافقوں کی واپسی ایک ہزار جمعیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ اُحد کی طرف روانہ ہوئے ۔ راستہ میں آپ (ﷺ) نے شوط کے مقام پر فوج کا معائنہ کیا تو کچھ نا آشنا لوگ نظر آئے استفسار پر پتہ چلا کہ ہزار کے لشکر میں عبداللہ بن ابی تین سو یہود اور غیر مسلموں کے ساتھ شریک ہیں ۔ نبی کریم ﷺ ایسے لوگوں کی فطرت سے خوب واقف تھے ۔ اس لیے آپ (ﷺ) نے فرمایا ۔ یا تو ایمان لاکر ہمارے شانہ بشانہ لڑو یا مدینہ واپس لوٹ جاؤ۔

مورخین کہتے ہیں کہ یہ واپسی عبداللہ بن ابی کی مرضی سے ہوئی ۔ مگر نبی ﷺ نے غیر مسلموں کی شرکت کو اسلام لانے کی شرط سے مشروط کیا ۔ یہود اور منافقین کی طرف سے متوقع بد عہدی کا خطرہ بھانپ کر نبی کریم ﷺ نے بروقت اندرونی دفاع مستحکم کیا ۔ بظاہر تین سو کی کمی کے باوجود اندرونی انتشار کا خطرہ ٹل گیا ۔

تیراندازوں کا تعیّن مسلم فوج کوہ اُحد کی گھاٹی کے بالکل آخری سرے پر تھی کوہ اُحد اُن کی پشت پر تھا صرف ایک گھاٹی سے دشمن کے رسالے کے متوقع حملے کا خطرہ تھا ۔ وہاں جبل

عینین پر رسالے کے متوقع حملے کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن جبیرؓ کی سرکردگی میں پچاس تیراندازوں کا دستہ مقرر کیا اور انہیں واضح الفاظ میں حکم دیا جو کمانداروں کیلئے عمدہ مثال ہے حضرت ابواسحاق سے روایت ہے۔

قال سمعت البراء یحدث قال جعل رسول اللہ ﷺ علی الرُّماۃ یوم اُحُدٍ وکانوا خمسین رجلا۔ عبداللہ بن جبیرؓ وقال ان رایتمونا تخطفنا الطیر فلا تبرحوا من مکانکم ھذا حتّٰی ارسل الیکم وان رایتموناھزمنا القوم واوطاناھم فلا تبرحوا حتّٰی ارسل الیکم۔ (سنن ابی داؤد: کتاب الجہاد)

رسول اللہ ﷺ نے جنگ اُحد میں پچاس تیراندازوں پر عبداللہ بن جبیرؓ کو افسر مقرر کیا اور فرمایا اگر تم ہم کو دیکھو کہ پرندے اچک رہے ہیں جب بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹو یہاں تک کہ تم بلائے جاؤ اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے کافروں کو شکست دی اور روند ڈالا۔ جب بھی اس جگہ سے نہ ہٹو جب تک بلائے نہ جاؤ۔

تیراندازوں کی تعیناتی سے سپاہ کے اندر تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ نیز ایک اہم دفاعی پوزیشن پر قبضہ عمل میں آ گیا۔

لشکر کی تنظیم نو اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو شروع میں مکمل فتح نصیب ہوئی کفار مکہ کے تعاقب میں عبداللہ بن جبیرؓ کی سرکردگی میں پچاس تیراندازوں میں سے تمیں تیرانداز اپنا مورچہ چھوڑ کر کفار کے تعاقب میں لگ گئے۔ سواروں کے کمانڈر خالد بن ولید نے جیسے یہ مورچہ کمزور دیکھا تو وہاں سے مسلمانوں کے عقب پر حملہ کر دیا۔ آگے سے پیدل فوج بھی واپس ہوئی اور یوں اسلامی لشکر دونوں طرف سے گھیرے میں آ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ آپ ﷺ کو چوٹیں آئیں اس کے باوجود بھی مجاہدین کو دوبارہ منظم کیا۔ دفاعی پوزیشن میں رہ کر صحابہ کو قریب پہاڑی پر چڑھا کر دشمن کے حملے سے بچایا۔ (جاری ہے)

قرآن خدا کی آواز

(مولانا وحیدالدین خاں)

۳۔قرآن کی تیسری خصوصیت جس کو میں اس کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن باوجود یکہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا، اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہوسکی، اگر صرف ایک انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔

چین کے نوجوان طلبہ کی ایک جماعت جو حکومت کے زیر اہتمام کیلی فورنیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہی تھی، ان میں سے تقریباً بارہ افراد نے برکلے کے گرجا گھر میں جاکر پادری سے کہا کہ وہ ان کیلئے اتوار کو ایک کلاس کا انتظام کرے، چینی نوجوانوں نے نہایت صفائی سے کہا کہ انہیں ذاتی طور پر عیسائیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ وہ خود عیسائی بننا چاہتے، البتہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مذہب نے امریکی تمدن پر کیا اور کتنے اثرات ڈالے ہیں، پادری نے اس جماعت کی ہفتہ وار تعلیم کے لئے ریاضیات اور فلکیات کے ایک عالم (Peter W.Stoner) کو مقرر کیا، اس واقعہ کے چار مہینے بعد تمام نوجوانوں نے عیسائیت قبول کرلی، اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ کیا تھی، اس کو خود معلم کی زبان سے سنئے:۔

''میرے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کے سامنے مذہب کی کون سی بات رکھی جائے، کیونکہ یہ نوجوان بائبل پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے، بائبل کی محض رواجی تعلیم بے فائدہ معلوم ہوتی تھی، اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا، میں نے اپنی تعلیم کے زمانے میں بائبل کے پہلے باب (کتاب پیدائش) اور سائنس میں بہت قریبی مناسبت پائی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کے سامنے یہی بات پیش کروں۔

میں اور طلبہ قدرتی طور پر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کائنات کی پیدائش کے متعلق یہ مواد زمین وآسمان کے بارے میں سائنس کی موجودہ معلومات حاصل ہونے سے ہزاروں سال پہلے لکھا گیا ہے، ہمیں یہ احساس تھا کہ موسیٰ کے زمانے میں کائنات کے متعلق لوگوں کے جو خیالات تھے، اس کو موجودہ زمانے کی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نہایت لغو معلوم ہوں گی۔

ہم نے پورا موسم سرما کتاب پیدائش کے پہلے باب میں گزار دیا، طلبہ کام لے کر یونیورسٹی کی لائبریری میں چلے جاتے اور بڑی محنت کے ساتھ جوابات تیار کر کے لاتے، موسم سرما کے خاتمہ پر پادری نے مجھے بتایا کہ طلبا کی پوری جماعت اس کے پاس یہ کہنے کیلئے آئی تھی کہ وہ عیسائی بننا چاہتے ہیں، انہوں نے اقرار کیا کہ ان کے اوپر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بائبل خدا کی الہامی کتاب ہے"۔ (The Edidence of God, P.P 137-38)

مثال کے طور پر زمین کی ابتدا کے بارے میں کتاب پیدائش کا فقرہ ہے:۔

''گہرائیوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا''۔

یہ موجودہ معلومات کے مطابق اس وقت کی بہترین تصویر ہے، جب زمین ابھی گرم تھی، اور اس کی گرمی کی وجہ سے پانی بخارات بن کر اڑ گیا تھا، اس وقت ہمارے تمام سمندر کثیف بادلوں کی شکل میں فضا میں معلق تھے، اور اس کی وجہ سے روشنی زمین کی سطح تک نہیں پہونچ پاتی تھی۔

ہمارا ایمان ہے کہ انجیل اور توراۃ اصلاً اسی طرح خدا کی کتابیں ہیں، جیسے قرآن خدا کی کتاب ہے، اس لئے ان میں علم الٰہی کے شرارے بلاشبہ موجود ہیں، مگر ان کتابوں کے اصل الفاظ محفوظ نہیں رہے، ہزاروں برس گزرنے کے بعد بائبل اب ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب کی شکل میں ہے، جس میں کریسی مارسین کے الفاظ میں ترجمہ(Translation) اور انسانی الحاق (Human Interpolation) کی وجہ سے اصل خدائی نسخہ کے مقابلے میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے۔ اس طرح یہ صحیفے پوری شکل میں اصل حیثیت کو کھو چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو منسوخ کر کے ہمارے لئے اپنی کتاب کا تصحیح شدہ اڈیشن (قرآن) نازل کیا، قرآن اپنی صحت اور جامعیت کی وجہ سے بدرجہ اتم ان خصوصیات کا حامل ہے، جن کی صرف ایک جھلک اب کتب قدیمہ میں باقی رہ گئی ہے۔

یہاں میں قرآن کی اسی خصوصیت کو اس کی صداقت کی تیسری دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں قرآن باوجودیکہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی، اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن ایک ایسے زمانے میں اترا جب انسان عالم فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، اس وقت بارش کے متعلق یہ تصور تھا کہ آسمان میں کوئی دریا ہے، جس سے پانی بہہ کر زمین پر گرتا ہے، اور اسی کا نام بارش ہے، زمین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ چپٹی فرش کی مانند ہے، اور آسمان اس کی چھت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر کھڑی کی گئی ہے، ستاروں کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ چاندی کی چمکتی ہوئی کیلیں ہیں، جو آسمان کے گنبد میں جڑی ہوئی ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے چراغ ہیں، جو رات کے وقت رسیوں کی مدد سے لٹکائے جاتے ہیں، قدیم اہل ہند یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر ہے، اور جب گائے زمین کو ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے تو اس کے سر کی جنبش سے زلزلہ آجاتا ہے، کوپرنیکس (۱۵۴۳ء۔۱۴۷۳ء) تک یہ نظریہ تھا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

اس کے بعد علم کی ترقی ہوئی، انسان کے مشاہدے اور تجربے کی قوت بڑھ گئی جس کی وجہ سے بے شمار نئی نئی معلومات حاصل ہوئیں، زندگی کا کوئی شعبہ اور علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں پہلے کے مسلمات بعد کی تحقیق سے غلط ثابت نہ ہو گئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا کوئی بھی انسانی کلام ایسا نہیں ہو سکتا جو آج بھی اپنی صحت کو پوری طرح باقی رکھے ہوئے ہو۔ کیونکہ آدمی اپنے وقت کی معلومات کی روشنی میں بولتا ہے، وہ شعور کے تحت بولے یا لاشعور کے تحت، بہرحال وہ وہی کچھ دہرائے گا، جو اس نے اپنے زمانہ میں پایا ہو، چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی کوئی بھی انسانی کتاب آج ایسی موجود نہیں ہے، جو غلطیوں سے پاک ہو۔ مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ جس طرح ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے دور میں برحق تھا، آج بھی وہ اسی طرح برحق ہے، زمانے کے گزرنے سے اس کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ واقعہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جس کی نگاہ ازل سے ابد تک محیط ہے۔ جو سارے حقائق کو اپنی اصل شکل میں جانتا ہے، جس کی واقفیت زمانے اور حالات کی پابند نہیں اگر یہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام ہوتا تو بعد کا زمانہ اسی طرح اس کو غلط ثابت کر دیتا، جیسے ہر انسانی کلام بعد کے زمانے میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔

قرآن کا اصل موضوع اُخروی سعادت ہے، اس لحاظ سے وہ دنیا کے معروف علوم وفنون میں سے کسی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر اس کا مخاطب چونکہ انسان ہے، اس لئے قدرتی طور پر اپنی تقریروں میں ہر اس علم کو مس کرتا ہے جس کا تعلق انسان سے ہے، یہ ایک بہت نازک صورت حال ہے کیونکہ آدمی اپنی گفتگو میں اگر کسی فن کو مس کر رہا ہے تو خواہ وہ اس پر کوئی تفصیلی کلام نہ کرے، اگر اس کی معلومات ناقص ہیں، تو یقینی طور پر وہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو صورت واقعہ سے ٹھیک ٹھیک مطابقت نہ رکھتے ہوں، مثلاً ارسطو نے عورت کی کمتری ثابت کرنے کیلئے یہ کہا کہ۔ ''اس کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ علم الاجسام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، مگر اس کے باجود ایک ایسا فقرہ ہے جو علم الاجسام سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مرد اور عورت کے منہ میں دانت کی تعداد یکساں ہوتی ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن اگرچہ اکثر علوم انسانی کو کہیں نہ کہیں مس کرتا ہے، مگر اس کے بیانات میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں آنے پائی جو بعد کی وسیع تر تحقیقات سے یہ ثابت کرے کہ یہ ایسے شخص کا کلام ہے، جس نے کمتر معلومات کی روشنی میں اپنی باتیں کہی تھیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بالاتر ہستی کا کلام ہے، جو اس وقت بھی جانتا تھا، جب کوئی نہیں جانتا تھا، اور ان چیزوں کو بھی جانتا تھا، جس سے اب تک لوگ ناواقف ہیں۔

یہاں میں مختلف علوم سے متعلق چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک علم کو مس کرتے ہوئے بھی قرآن کس طرح حیرت انگیز طور پر ان صداقتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، جو قرآن کے نزول کے وقت معلوم شدہ نہیں تھیں، بلکہ بعد کو دریافت ہوئیں۔

اس بحث سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جدید تحقیقات سے قرآنی الفاظ کی مطابقت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ یہ تحقیقات متعلقہ واقعہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو چکی ہیں اور اس طرح مادی کائنات کے بارے میں قرآن کے اشاراتی الفاظ کی تفسیر کیلئے ہم کو ضروری مواد حاصل ہو گیا ہے، اب اگر مستقبل کا مطالعہ کسی موجودہ تحقیق کو کلاً یا جزاً غلط ثابت کر دے تو اس سے کسی بھی درجہ میں قرآن کی تغلیط نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ قرآن کے

مجمل اشارہ کے تفصیلی تعین میں غلطی ہوگئی تھی، ہم کو یقین ہے کہ آئندہ کی صحیح تر معلومات قرآن کے اشاراتی الفاظ کو زیادہ صحیح طور پر واضح کرنے والی ہوں گی، وہ کسی اعتبار سے اس سے مختلف نہیں ہوسکتیں۔

اس سلسلے میں قرآن کے جو بیانات ہیں، ان کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو ان امور سے متعلق ہیں، جن کے متعلق انسان کو نزول قرآن کے وقت کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں تھیں، اور دوسرے وہ جن کے متعلق وہ سطحی اور ظاہری معلومات رکھتا تھا۔

کائنات کی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق دور سابق کے لوگ کچھ نہ کچھ جانتے تھے۔ مگر ان کا یہ علم ان دریافتوں کے مقابلے میں بے حد ناقص اور ادھورا تھا، جو بعد کو علمی ترقی کے دور میں انسان کے سامنے آئیں، قرآن کی مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی سائنسی کتاب نہیں تھی، اس لئے اگر وہ عالم فطرت کے بارے میں یکایک نئے نئے انکشافات لوگوں کے سامنے رکھنا شروع کر دیتا تو انہیں چیزوں پر بحث چھڑ جاتی اور اس کا اصل مقصد ''ذہن کی اصلاح'' پس پشت چلا جاتا، یہ قرآن کا اعجاز کہ اس نے علمی ترقی سے بہت پہلے کے زمانے میں اس طرح کی چیزوں پر کلام کیا اور ان کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کئے جس میں دور سابق کے لوگوں کیلئے توحش کا کوئی سامان نہیں تھا، اور اسی کے ساتھ بعد کے انکشافات کا بھی وہ پوری طرح احاطہ کئے ہوئے تھے۔

الف: ۔قرآن میں دو مقامات پر پانی کا ایک خاص قانون بیان کیا گیا ہے، اول سورہ فرقان میں، دوسرے سورۂ رحمان ہیں:۔

اول الذکر اقتباس حسب ذیل ہے۔

وھوالذی مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخا وحجرا محجورا (الفرقان۔۵۳)

''اور وہی ہے جس نے ملائے دو دریا، ایک کا پانی میٹھا خوشگوار ہے اور ایک کا کھاری تلخ، اور دونوں کے درمیان ایک آڑ رکھ دی''۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں:۔

مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیانo (الرحمٰن ۔۱۹۔۲۰)

''اس نے چلائے دو دریا ملتے ہوئے دونوں کے درمیاں ایک آڑ ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کرسکتے''۔

ان آیات میں جس مظہر فطرت کا ذکر ہے، وہ قدیم ترین زمانے سے انسان کو معلوم تھا، وہ یہ کہ دو دریاؤں کے پانی جب باہم مل کر بہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے میں شامل نہیں ہو جاتے مثال کے طور پر چاٹگام (مشرقی پاکستان) سے لے کر ارکان (برما) تک دو دریا مل کر بہتے ہیں، اور اس پورے سفر میں دونوں کا پانی بالکل الگ الگ نظر آتا ہے، دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے، ایک طرف کا پانی میٹھا اور دوسری طرف کا کھاری، اسی طرح سمندر کے ساحلی مقامات پر جو دریا بہتے ہیں، ان میں سمندر کے اثر سے برابر مدوجزر (جوار بھاٹا) آتا ہے، مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مخلط نہیں ہوتے اوپر کھاری رہتا ہے، نیچے میٹھا، اس کے بعد جب جزر ہوتا ہے تو اوپر سے کھاری پانی اتر جاتا ہے، اور میٹھا جوں کا توں رہتا ہے، الہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے مقام پر میں نے خود دیکھا کہ دونوں دریا ملنے کے باوجود الگ الگ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور درمیان میں ایک لکیر مسلسل چلی گئی ہے۔

یہ بات قدیم ترین زمانے سے انسان کے مشاہدے میں آچکی ہے، مگر یہ واقعہ کس قانون فطرت کے تحت واقع ہوتا ہے، یہ ابھی حال میں دریافت کیا گیا ہے، جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رقیق اشیا میں سطحی تناؤ (SURFACE TENSION) کا ایک خاص قانون ہے، اور یہی دونوں قسم کے پانی کو الگ الگ رکھتا ہے۔۔۔ چونکہ دونوں سیالوں کا تناؤ (TENSION) مختلف ہوتا ہے، اس لئے وہ دونوں کو اپنی اپنی حد میں روکے رہتا ہے، آج کل اس قانون کو سمجھ کر جدید دنیا نے بے شمار فوائد حاصل کئے ہیں، قرآن نے ''**بینھما برزخ لایبغیان**'' کے الفاظ بول کر اس واقعہ کی ایسی تعبیر کی جو قدیم مشاہدے کے اعتبار سے بھی ٹکرانے والی نہیں تھی، اور اب جدید دریافت پر بھی وہ پوری طرح حاوی ہے، کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برزخ (آڑ) سے

مرادوہ سطح کا تناؤ(Surface Tension) ہے، جودونوں قسم کے پانی کے درمیان پایا جاتا ہے،اور جودونوں کومل جانے سے روکے ہوئے ہے۔

سطحی تناؤ کے قانون کوایک سادہ سی مثال سے سمجھئے،اگرآپ گلاس میں پانی بھریں تو وہ کنارے تک پہنچ کرفوراً بہنے نہیں لگے گا،بلکہ ایک سوت کے بقدراُٹھ کرگلاس کے کناروں کے اوپرگولائی میں ٹھہرجائے گا،یہی وہ چیز ہے جس کوشاعر نے ''خط پیانہ'' کہا ہے۔

اندازۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ

ساغر سے اُٹھیں موجیں بن کر خط پیانہ

گلاس کے کناروں کےاوپرپانی کی مقدارہوتی ہے،وہ کیسے ٹھہرتی ہے،بات یہ ہے کہ رقیق اشیا کی سطح کے سالمات (Molecules) کے بعد چونکہ کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے ان کا رُخ اندر کی طرف ہوجاتا ہے،اس طرح کے سالمات کے درمیان کشش اتصال بڑھ جاتی ہے،اور قانون اتصال(Cohesion) کےعمل کی وجہ سے پانی کی سطح کے اوپرایک قسم کی لچکدارجھلی (Elastic Film) سی بن جاتی ہے،اورپانی گویااس کے غلاف میں اس طرح ملفوف ہوجاتا ہے،جیسے پلاسٹک کی سفید جھلی میں پیاہوانمک ملفوف ہوتا ہے،سطح کا یہی پردہ اوپرابھرے ہوئے پانی کوروکتا ہے،یہ پردہ اس حدتک قوی ہوتا ہے کہ اگراس کےاوپرسوئی ڈال دی جائے تو وہ ڈوبے گی نہیں بلکہ پانی کی سطح پرتیرتی رہے گی،اسی کو سطحی تناؤ کہا جاتا ہے،اوریہی وہ سبب ہے جس کی بناپرتیل اورپانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے اوریہی وہ ''آڑ'' ہے،جس کی وجہ سے کھاری پانی اورمیٹھے پانی کے دودریا مل کربہتے ہیں مگرایک کاپانی دوسرے میں شامل نہیں ہوتا۔

ب:۔ارشادہوتا ہے۔

اللّٰہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونھا(رعد۔۲)

''اللہ وہ ہےجس نےآسمان کوبلندکیا،بغیرایسے ستونوں کےجنہیں تم دیکھ سکو''۔

دورقدیم کے انسان کیلئے یہ الفاظ اس کے ظاہری مشاہدے کے عین مطابق تھے،کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے سر کےاوپرسورج،چانداورستاروں کی ایک دنیا کھڑی ہے،مگرکہیں اس کا پایہ اورکھمبا نظرنہیں آتااوراب جدید ترین معلومات رکھنے والے انسان کیلئے بھی اس میں مکمل

معنویت موجود ہے، کیونکہ جدید ترین مشاہدہ بتاتا ہے کہ اجرام سماوی ایک لامحدود خلا میں بغیر کسی سہارے کے قائم ہیں، اور ایک ''عمد غیر مرئی''، یعنی کشش ثقل (Gravitational Pull) ان کو بالائی فضا میں سنبھالے ہوئے ہے۔

ج۔اسی طرح سورج اور تمام ستاروں کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

كل في فلك يسبحون۔(الانبیاء۔۳۳)

''سب کے سب ایک آسمان میں تیر رہے ہیں''۔

دورِ قدیم میں بھی انسان اجرام سماوی کو حرکت کرتا ہوا دیکھتا تھا، اس لئے ان الفاظ سے اس کو توحش نہیں ہوا، مگر جدید معلومات نے ان الفاظ کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے، بسیط اور لطیف خلا میں اجرام سماوی کی گردش کیلئے ''تیرنے'' سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی۔

د:۔رات اور دن کے متعلق قرآن میں ہے:۔

يغشي اليل النهار يطلبه حثيثًا۔(الاعراف۔۵۴)

''اللہ اوڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا''۔

یہ الفاظ قدیم انسان کیلئے صرف رات دن کی ظاہری آمد و شد کو بتاتے تھے، مگر اس میں نہایت عمدہ اشارہ زمین کی محوری گردش کی طرف بھی موجود ہے، جو جدید مشاہدے کے مطابق رات اور دن کی تبدیلی کی اصل وجہ ہے، یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ روس کے پہلے خلائی مسافر نے خلا سے واپسی کے بعد اپنے جو مشاہدات بیان کئے تھے، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ زمین کو اس نے اس شکل میں دیکھا کہ سورج کے سامنے محوری گردش کی وجہ سے اس کے اوپر اندھیرے اور اُجالے کی آمد و رفت کا ایک تیز تسلسل (Rapid Succession) جاری تھا۔

اس طرح کے بیانات قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری مثالیں وہ ہیں، جن کے متعلق پچھلے زمانے کے لوگ قطعاً کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے، قرآن نے ان کا ذکر کیا، اور ایسی باتیں کہیں جو حیرت انگیز طور پر جدید انکشافات سے صحیح ثابت ہوتی ہیں، یہاں میں مختلف علمی شعبوں سے اس کی چند مثالیں پیش کروں گا۔(جاری ہے)

ایک بڑی فورس

(جاوید چوہدری)

یہ آج سے پانچ برس پرانی بات ہے۔ہم چار دوست اکٹھے رہتے تھے،ہمارے گھر قریب قریب تھے،ہم صبح،دوپہر اور شام ایک دوسرے کو ملتے تھے،ہم سب کی زندگیوں میں بے ترتیبی،بے سکونی اور بے چینی تھی،ہم ایک مشکل سے نکلتے تھے تو دوسری میں پھنس جاتے تھے،ایک پریشانی ختم ہوتی تو دوسری کندھوں پر آ بیٹھتی تھی،ہم میں سے تین عام دنیا دار قسم کے لوگ تھے لیکن ہمارا چوتھا ساتھی دین دار،تہجد گزار اور صوفی منش شخص تھا،وہ چوبیس گھنٹے باوضو رہتا تھا اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ذکر چلتا رہتا تھا،مگر اس عبادت اور ریاضت کے باوجود اس کی زندگی بھی ہماری طرح بے سکونی اور عدم استحکام کا شکار تھی۔وہ بھی ہماری طرح ہر وقت پریشان اور بے چین رہتا تھا۔ایک دن ہم چاروں ایک درویش کے پاس حاضر ہو گئے۔

درویش ایک دلچسپ شخص تھا،وہ بیک وقت ایک کامیاب تاجر،ایک باعمل عالم،ایک تارک الدنیا صوفی اور ایک سخت مزاج منتظم تھا۔وہ ہم سب کا مشترکہ دوست تھا،ہم سب اس کے محل میں اس کے سامنے بیٹھ گئے،وہ اڑھائی ایکڑ کے ایک بڑے محل میں رہتا تھا لیکن اس کا کمرہ بہت سادہ بلکہ بہت غریبانہ تھا،پورے کمرے کی واحد قیمتی چیز گکھڑ منڈی کی دس بائی آٹھ فٹ کی بوسیدہ سی دری تھی۔درویش کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے تھے،وہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا۔اور ہفتے میں پانچ دن روزے رکھتا تھا،اس نے ہماری پریشانیاں سن کر قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا" تم لوگ غلط انداز سے زندگی گزار رہے ہو،تمہاری زندگی کی ترتیب غلط ہے،لہٰذا تمہاری زندگیوں میں سکون اور آرام کیسے آ سکتا ہے،تمہاری پریشانیاں کیسے کم ہو سکتی ہیں"۔ہم نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا،اس نے مسکرا کر چائے کے کپ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیئے۔"دیکھو اگر تم زندگی کا سلیقہ جاننا چاہتے ہو تو وہ تمہیں سیرت نبویؐ میں ملے گا،سکون اور اطمینان تک پہنچنے کے سارے فارمولے رسول اللہﷺ کی حیات طیبہ میں پوشیدہ ہیں"۔وہ رُکا،اس نے غور سے ہمارے چہرے دیکھے اور پھر گویا ہوا"اسلامی ریاست کے چار ستون تھے،

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ، ان چاروں حضرات نے اسلام کی کامیابی میں بڑا مرکزی کردار ادا کیا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا، تم لوگ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہو"۔ اس نے رک کر ہم سے پوچھا ، ہم نے ہاں میں گردن ہلا دی، وہ اپنے مخصوص انداز سے مسکرایا اور آہستہ اور میٹھے لہجے میں بولا" یہ اصحابؓ، یہ حضراتؓ ایک مخصوص طرز زندگی گزارتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق فقر اور غنا کا دوسرا نام تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک مکمل اور مضبوط معیشت کی علامت تھے، ان کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا جب حضرت عثمانؓ کا آخری اونٹ شام سے نکلتا تھا تو پہلا مدینہ پہنچ چکا ہوتا تھا۔ عرب میں کہا جاتا تھا تجارت سیکھنی ہو تو عثمانؓ سے سیکھو، وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہتے، حضرت عمرؓ منتظم تھے، وہ ایک مکمل روٹین، ایک شاندار ایڈمنسٹریشن کا نام تھے، وہ قوت ارادی اور اٹل پن کی علامت تھے، تم لوگ خود سوچو جس شخص کے ایمان کا آغاز ہی اس فعل سے ہو کہ وہ گھروں میں چھپے مسلمانوں کو ساتھ لے، انہیں خانہ کعبہ لائے اور پھر کہے تم لوگ سب کے سامنے نماز پڑھو، عمرؓ کی تلوار تمہاری حفاظت کرے گی۔ اس شخص کی قوت ارادی کی کیا سطح ہوگی، وہ کس قدر مضبوط فیصلے کا مالک ہوگا اور آخر میں حضرت علیؓ، درویش رکا، اس نے لمبی سانس لی اور اسی رواں لہجے میں بولا" حضرت علیؓ اس دور کے سب سے بڑے عالم تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، میں علم کا شہر ہوں تو علیؓ اس کا دروازہ ہیں، یہ چار حضرات کا ساتھ ثابت کرتا ہے، اسلام جیسے مذہب کو بھی اپنے اظہار کیلئے فقر، معیشت، انتظامی مہارت اور علم کی ضرورت ہوتی ہے"۔

وہ رکا تو میں نے بے چین ہو کر پوچھا" یا درویش تمہارے اس فلسفے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے، ہم اپنی بات کر رہے ہیں اور تم ہمارے گرد اسلام کا دائرہ کھینچ رہے ہو"۔ درویش نے قہقہہ لگایا" بیوقوفو! میں تمہیں تمہارے مسئلے کا حل بتا رہا ہوں، یہ چاروں حضراتؓ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام جیسے آفاقی نظریے کو بھی عملی تفسیر کیلئے ایک فقیر، ایک منتظم، ایک معیشت دان اور ایک عالم کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا معاشرہ ہو یا فرد جس بندے کے پاس علم نہیں، جس کے پاس ضروریات زندگی کیلئے مناسب رقم نہیں، جس کی زندگی میں نظم وضبط نہیں اور جس کی ذات میں

حضرت ابوبکرؓ جیسا فقر نہیں، وہ ایک اچھی اور پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا، تم لوگوں کا یہی مسئلہ ہے"۔ درویش رکا اور اس نے ہم میں سے ایک کے چہرے پر نظریں گاڑھیں اور بولا "مثلاً تم، تمہارے پاس روپیہ، پیسہ تو ہے، تم کروڑ پتی ہو لیکن تمہارے اندر کا فقیر مر چکا ہے، تمہارا علم اخبار بینی تک محدود ہے اور تمہاری انتظامی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں، لہٰذا تم بے سکون ہو اور تم" وہ مولوی صاحب کی طرف مڑا "تم نے پوری زندگی رکوع و سجود میں لگا دی، تمہارے بچے روز بھوکے پیٹ سکول جاتے ہیں، خود تم اپنی بھوک کو روزے کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہتے ہو اور تم" وہ میری طرف مڑا "تم کتابوں کے پہاڑ سے کود کر خودکشی کر رہے ہو اور تم" وہ ہمارے چوتھے ساتھی کی طرف مڑا "تم اپنے گھر والوں کی ساری ضرورتوں، ساری خواہشوں کو ڈسپلن تلے کچل رہے ہو، تم اپنی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے زندگی کو سیدھا اور ہموار بنانا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو، انتظام اچھی چیز ہوتا ہے، لیکن وہ ایک روپے کو پچاس روپے نہیں بنا سکتا" درویش نے ٹانگیں سیدھی کیں اور مسکرا کر بولا "بے وقوفو صرف عام شخص نہیں دنیا میں صرف وہ ملک ترقی کی معراج تک پہنچتے ہیں جن کے پاس یہ چاروں چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں اور وہ تمام ملک پیچھے رہ جاتے ہیں جو ایک ستون پر پوری عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بے وقوفو! اگر صرف فقہ سے ملک چل سکتے تو طالبان کا افغانستان اس وقت دنیا کی سپر پاور ہوتا" وہ رکا اور ہنس کر بولا "لیکن ایسا نہیں ہوا، دنیا کی کوئی عمارت صرف ایک ستون پر کھڑی نہیں رہ سکتی، اسے استحکام کیلئے بیک وقت چار ستون درکار ہوتے ہیں، تم لوگ بھی اپنی زندگی میں ایسی ترتیب پیدا کرو، تمہیں یہ دنیا جنت لگنے لگے گی اور حکومت کو بھی بتاؤ وہ صرف معیشت پر توجہ نہ دے، وہ معیشت کے ساتھ ساتھ ملک میں درویشوں، عالموں اور منتظمین کی ایک بڑی فورس بھی پیدا کرے، تب کہیں جا کر ملک ترقی کرے گا۔ (بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

بدی کا رہبر۔۔۔ٹیلیوژن

(انتخاب کاشف گل)

طوائفوں اور بھانڈوں کے کسی ٹولے کو بچوں کی تعلیم و تربیت پر مامور کرنے کا تصور بھی اگر چہ کوئی شریف آدمی نہیں کر سکتا لیکن آج ہم سب تقریباً بلا استثناء کر یہی رہے ہیں۔ ٹیلی وژن کے مختلف قومی ،نجی اور بین الاقوامی چینلوں کے توسط سے ہم نے اس کام کے لئے دنیا بھر کے ایسے اوباشوں ،بازاری اور بدکردار مردوں اور عورتوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جن کے شرمناک اسکینڈلوں کی داستانیں آئے دن اخبارات کی زینت بنی رہتی ہیں۔

ٹیلی وژن سے جو ابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے اگر چہ اخلاق کی تعمیر کا کام بھی اسی طرح انتہائی مئوثر انداز میں لیا جا سکتا ہے جس طرح اخلاق کی تخریب اور اس کو بگاڑنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں مسلّط شیطانی روشن خیال تہذیب کو یہ قطعاً گوارا نہیں۔

انسان کو شکار کرنے کیلئے اس کے ازلی دشمن شیطان کے ترکش میں سب سے زہریلا تیر صنفی بے راہ روی کا فروغ ہی ہے۔ جس کا یقینی ذریعہ عریانی کا فتنہ ہے۔ آدم اور حوا علیہا السلام پر اس نے ان کے جنت کے قیام کے دوران یہی حربہ آزما کر انہیں راہ راست سے بھٹکانا چاہا تھا۔ اس شیطانی سازش کی خبر قرآن میں اس طرح دی گئی ہے" پھر شیطان نے انہیں بہکایا تا کہ ان کے جسم کے ان حصوں کو ان کے سامنے کھول دے جو ایک دوسرے سے چھپائے گئے تھے"۔

(الاعراف۔20)

انسان کو نیچا دکھانے کیلئے آج بھی شیطان کے پاس سب سے مؤثر اور بڑا ہتھیار یہی ہے۔ اسی بناء پر قرآن صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ تمام اولاد آدم کو آج بھی پکار پکار کر شیطان کی اس چال سے یوں خبر دار کر رہا ہے:۔

"اے بنی آدم ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان کے جسم سے اتروا دیئے تھے۔ تا کہ ان کے جسم کے پوشیدہ حصے ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔ شیطان اور اس کے ساتھی

تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں تم انہیں نہیں دیکھ سکتے ۔ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنادیا جو ایمان نہیں لائے''۔ (الاعراف۔27)

ٹی وی کے مقامی چینلوں کے علاوہ کیبل اور ڈش کے ذریعہ دیکھے جانے والے دنیا کے درجنوں اسٹیشنوں سے دن رات تفریح کے نام سے پیش کئے جانے والے جن پروگراموں، فلموں اور ڈراموں کی یلغار ہے بالعموم ان سب میں قدرِ مشترک عورتوں اور مردوں کے بے حجابانہ اختلاط کے مناظر اور مختلف پرکشش زاویوں سے انسانی جسموں کی نمائش کا اہتمام ہی ہوتا ہے۔ ان سب میں آزادی کے نام پر مردوں اور عورتوں کے ناجائز تعلقات کو مطلوب اور پسندیدہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ڈش کے ذریعے ایسے پروگرام بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن میں صنفی عمل کی تقریباً ساری تفصیلات پیش کر دی جاتی ہیں اور ساحل سمندر پر ہونے والی بے ہودگیوں کے مناظر بھی ناظرین کی تفریح طبع کے لئے ان تک پہنچائے جاتے ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور دوسرے مقامی چینل بھی حتی المقدور اس دوڑ میں شریک ہیں اگرچہ ان کیلئے ہماری مذہبی اور تہذیبی اقدار اور روایات کی وجہ سے ابھی تو اس حد تک جانا ممکن نہیں ۔لیکن ان پابندیوں کی تمام دیواروں کو جلد از جلد توڑ ڈالنے کی سرتوڑ کوشش ان کی طرف سے بہر حال جاری ہے اور لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکہ اچھل کود کے ساتھ پیش کئے جانے والے فحش گانوں اور بے غیرتی کے کھلے مناظر پر مبنی ڈرامے اب ہمارے ٹی وی کا خاصہ وقت ان کیلئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ضبط تولید اور بچوں کی پیدائش سے متعلق اور دیگر اشتہارات میں بالعموم فحاشی کا عنصر اتنا بڑھ گیا ہے کہ کسی غیرت مند آدمی کیلئے انہیں دیکھنا خود کو سخت آزمائش میں مبتلا کر لینا ہے۔

یہ ہے وہ ٹیلی ویژن جس کے سامنے آج چار پانچ سال کے معصوم بچوں سے لے کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ہی نہیں، بڑوں اور بوڑھوں کے فرصت کے اوقات کا زیادہ حصہ گزرتا ہے جو اوسطاً دن کے 24 گھنٹوں میں سے 6 تا 8 گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔بعض گھرانوں میں یہ

تناسب اس سے بھی زیادہ ہے۔وی سی آر، سی ڈیز اور انٹرنیٹ پر دیکھا جانے والا ہر طرح کا غلیظ مواد اس کے علاوہ ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اخلاقی تربیت کا وہ پورا نظام جو کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے معاشرے کے تمام شریف گھرانوں، خاندان کے بزرگوں اور بچوں کے درمیان تربیت دینے اور لینے والوں کی صورت میں قائم تھا، بالکل تلپٹ ہو کر رہ گیا اور وہ شرم و حیاء بڑی حد تک رخصت ہو چکی جو قوم کی اخلاقی اور دینی صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس کے ہر فرد میں موجود ہونا ضروری ہے اور ارشادِ نبویؐ کے مطابق حیا نصف ایمان ہے کیونکہ شرم و حیاء کی عدم موجودگی، انسان کے لئے گناہ کی جانب پیش قدمی میں کوئی رکاوٹ بھی رہنے نہیں دیتی جبکہ بے شرمی اور بداخلاقی کی راہ کو ہر سطح پر مخلوط محفلوں اور مخلوط تعلیم کے رواج نے مزید آسان کر دیا ہے۔صورت حال اس قدر سنگین ہو چکی ہے کہ اب تذبذب اور گومگو کی کیفیت کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے گھروں کو جلتا دیکھتے رہیں اور آگ بجھانے کے لئے کچھ نہ کریں، قوم کی اخلاقی تباہی کی جو مہم ٹی وی کے ذریعے شروع کر رکھی ہے۔یہ ملک دشمنی کی بدترین شکل ہے۔یہ پاکستان کی آئندہ نسلوں کو اعلیٰ صلاحیتوں سے محروم کر کے دیمک زدہ بنا دینے والی ہے۔ دستور کی رو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لئے سازگار فضا تیار کرنے کے پابند ہیں۔لہٰذا انہیں قرآن و سنت کے تقاضوں کے منافی ماحول بنانے کی اجازت تو ظاہر ہے کہ کسی صورت نہیں دی جا سکتی اور ان کی جانب سے ایسے اقدامات لامحالہ دستوری تقاضوں کی خلاف ورزی قرار پائیں گے۔جو لوگ اس کے ذمہ دار ہیں وہ ملک اور قوم ہی کے نہیں، اللہ اور رسولؐ کے بھی مجرم ہیں اور قرآن نے ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کا یوں اعلان کیا ہے ''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔'' (النور۔90)

دو قابل قدر جذبے:

اللہ تعالیٰ نے انسانی نسل کے تحفظ اور انسانی معاشرہ کے قیام اور اس کی بقا کے لئے انسانوں میں دو جذبے حیاء اور غیرت رکھے ہیں۔اگر یہ دو جذبے عطا نہ کئے جاتے تو انسانیت کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔یہ جذبات مرد اور عورت دونوں میں پائے جاتے ہیں۔مگر عورتوں پر حیاء کی صفت کا غلبہ زیادہ رہتا ہے اور اسے عورت کی نسوانیت کا زیور سمجھا جاتا ہے۔جبکہ غیرت مردانگی کی علامت اور مرد کا شیوہ سمجھی جاتی ہے۔اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ جذبات دب جائیں یا مضمحل ہو جائیں یا ختم ہو جائیں تو انسانیت کی بقاء داؤ پر لگ جائے۔

جذبہ حیاء ہی وہ واحد جذبہ ہے جو عورت جیسی کمزور مخلوق کو آوارہ اور بدکار مردوں کی شیطنت سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے وہ قوت بخشتا ہے جو عورت کو غلط راہوں پر پڑنے اور فحاشی اور عریانیت سے روکتا ہے۔اور یہی وہ جذبہ ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک مرد پر اکتفا کرے اور ایک مرد کے ساتھ رہ کر نسل انسانی کی بقاء اور اس کے تحفظ کے فرائض صحیح طور پر انجام دے۔اسی وجہ سے کتاب وسنت میں اس جذبہ کو بہت ابھارا گیا ہے اور اس کی بڑی تحسین کی گئی ہے۔چنانچہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سناتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جب وہ مدین پہنچے تو وہاں ایک کنوئیں پر آئے تو دیکھا کہ دو لڑکیاں انتظار میں کھڑی ہیں کہ کب مرد فارغ ہوں تو وہ بڑھ کر اپنے مویشیوں کو پانی پلائیں۔وہ مارے حیاء کے مردوں سے دور کھڑی رہیں اور بے حجابانہ ان میں گھسی نہیں۔اسی طرح بعد میں جب موسیٰ نے انہیں پانی بھر کر دے دیا تو ان میں سے ایک جب اپنے گھر سے واپس آئی تاکہ موسیٰ کے احسان کا بدلہ دلوائے تو قرآن اس کی حیاء بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

''ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ہوئی ان کے پاس آئی''(القصص)

یہاں لڑکی کی حیاء کا تذکرہ مدح اور ستائش کے لئے کیا گیا ہے۔اسی طرح احادیث میں بھی

حیاء کی تلقین آئی ہے۔حضورؐ نے واضح طور پر فرمایا۔حیاء جزو ایمان ہے(بخاری ومسلم)اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: حیاء تو خیر ہی خیر ہے۔(بخاری مسلم)

ایک اور حدیث میں تو دوٹوک الفاظ میں صاف صاف یوں فرمایا: جب تجھ میں حیاء نہ رہے تو جو چاہے کر(بخاری داؤد)

عورت کے بالکل برعکس مرد چونکہ فطرتاً جارح اور طاقتور پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی طاقت اور جارحیت کے بل بوتے پر ہی عورت پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے اس لئے قدرت نے اس کے اندر غیرت کا مادہ رکھ دیا ہے جس کا اصل مقصد بھی انسانی نسل کی بقاء اور اس کا تحفظ ہی ہے کیوں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر مرد میں غیرت نہ ہو تو اس کی ماں، بیوی یا بہن یا بیٹی کی قدرتی کمزوری سے دوسرے فائدہ اٹھائیں گے۔یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں مرد کے لئے غیرت ایک بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔خود عورت بھی فطرتاً ایسے مرد کے دامن میں تحفظ محسوس نہیں کرتی جو بے غیرت ہو۔

قرآن اور حدیث میں غیرت کی صف کو بہت ابھارا گیا ہے اور اس کی انتہائی تصویب اور ترغیب فرمائی گئی ہے۔نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

''مومن غیرت مند ہوتا ہے اور اللہ سب سے زیادہ غیور ہے''(مسلم)

ایک اور حدیث میں فرمایا۔اللہ سے بڑھ کوئی غیور نہیں۔اس لئے اس نے ظاہری اور باطنی ہر قسم کے فواحش کو حرام کر دیا ہے۔(بخاری ومسلم)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حیاء اور غیرت ہی وہ دو جذبات ہیں کہ صرف انہی کی وجہ سے بدکاری اور فحاشی کا دروازہ بند ہوتا ہے اور اگر کسی معاشرے میں خدانخواستہ یہ جذبات فنا ہو جائیں تو بدکاری اور فحاشی کے وہ مناظر سامنے آئیں گے کہ الامان والحفیظ۔جس کا کچھ اندازہ آج کی مغربی دنیا کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

ٹی وی کی ہلاکت خیز تفریح کا پہلا حملہ جیسا کہ تجربہ بتاتا ہے، انسان کی حیاء اور غیرت پر ہی

ہوتا ہے ۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹی وی کا ہر ڈرامہ اور ہر پروگرام عشق و محبت کی تربیت دینے اور محبت کے نام پر نسل انسانی کی شرم وحیاء اور غیرت کو ختم کرنے کا پورا پورا انتظام کئے ہوئے روزانہ پیش ہوتا ہے لہٰذا جب دن میں کئی کئی گھنٹے ٹی وی میں بے ہودہ اور فحش ادائیں اور اخلاق سے گری ہوئی حرکات دیکھی اور ڈائیلاگ سنے جائیں تو لامحالہ ان کے اثرات مرتب ہوں گے۔ اور ہر ٹی وی دیکھنے والا اپنی عمر اور اپنے ظرف کے مطابق اس کا اثر قبول کرے گا۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ چنانچہ اس انسانی فطری جذبے کے تحت ٹی وی پر بے حیائی اور بے غیرتی پر مبنی پروگراموں کے بار بار مشاہدے کے بعد ٹی وی دیکھنے والے کی شرم اور غیرت کا جنازہ نکل جاتا ہے اور وہ بتدریج بے حیاء اور بے غیرت بن جاتا ہے ۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی یہ منزلیں اس وقت اور بھی زیادہ تیزی اور تندی سے طے ہوجاتی ہیں جب ٹی وی اکٹھے بیٹھ کر دیکھا جائے ۔

اصلاح ۔۔۔ایک مشکل کام:

لا تفسدو فی الارض بعد اصلاحہا

انسان کی اصلاح ایک بڑا مشکل کام ہے ۔اس کا بگاڑنا کوئی مشکل کام نہیں ۔اصلاح کرنی ہوتو سالہا سال کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے ہوتی ہے۔ بگاڑنا ہوتو اس کے لئے کوئی خاص محنت اور کوشش درکار نہیں ہوتی ۔ بسا اوقات صرف اصلاح کی کوشش سے غفلت ہی کافی ہوجاتی ہے ۔روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی زندگی میں جتنی بھی اصلاح ہوئی ہے انبیا علیہم السلام اور نوع انسانی کے نیک انسانوں کی ہزار ہا برس کی کوشش سے ہوئی ہے ۔ایک ایک برائی کا سد باب کرنے اور ایک ایک بھلائی کو قائم کرنے میں خدا کے صالح بندوں کو صد ہا برس کی محنت کرنی پڑی ہے تب جا کر دنیا میں کچھ عالمگیر اخلاقی اصولوں اور ضابطوں پر انسانی تہذیب کی تعمیر ہوسکی ہے ۔اس تعمیر کو برباد تو آسانی سے کیا جا سکتا ہے مگر پھر سے اس کو تعمیر کر دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے ۔ایک معمولی سی شکل دیکھئے ۔صرف یہ بات کہ عورت اور مرد کا تعلق نکاح کے سوا کسی

اورصورت میں نہ ہو،انسان کواس کا قائل کرنا ،اس کا خوگر بنانا اور معاشرے میں اس کو ایک مسلم ضابطےاور قانون کی حیثیت سے رواج دینا، اور محرمات کے تعلقات کی عزت وحرمت قائم کرکے ان کوصنفی میلان سے اس قدر پاک کردینا کہ ان رشتوں کے مرد اور عورتیں کبھی یہ تصور بھی نہ کرسکیں کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں، اتنا مشکل کام تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور صالحین نوع انسانی کواس کے لئے ہزار ہابرس تک کوشش کرنی پڑی ہوگی تب کہیں دنیا میں یہ ایک اصلاح نافذ کی جاسکی ہوگی۔اس لئے کہ انسان میں جنسی انارکی اور بغاوت کی طرف ایسازبردست رجحان اور میلان موجود ہے کہ اسے ایک اخلاقی ضابطہ کا پابند بنادینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔اس اصلاح کو ضائع کردینے کیلئے کسی بڑی محنت کی ضرورت نہیں، بس عورتوں اور مردوں میں آزادانہ میل ملاقات اوراختلاط کی راہیں کھول دیجئے اور خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع اور وسائل عام لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچا دیجئے۔جنسی انارکی اور شہوت کا ''دیو'' جس کو مشکل سے باندھا گیا ہے، ایک دفعہ کھل جانے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے اس ساری اصلاح کو غارت کردے گا جو ہزاروں برس کی کوشش سے ہوئی تھی۔اگر آپ چاہیں کہ پھراس دیو کوقید کر دیں تو یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔اس کیلئے پھر صد ہا برس ہی کی محنتیں درکار ہوں گی۔اس لئے قرآن مجید انسانیت کے غارت گروں کومتنبہ کرتا ہے کہ زمین میں جو اصلاح بڑی مشکلوں سے ہوئی ہے،اس کوتم اپنی حماقتوں سے برباد نہ کرو۔

''**لا تفسدو فی الارض بعد اصلاحھا** زمین میں اصلاح ہوجانے کے بعد اس میں بگاڑ پیدا نہ کرو''۔

اِسی ایک مثال سے آپ قیاس کر لیجئے کہ کتنی برائیوں کا سدباب کرکے اس کیلئے زمین صاف کی گئی ہوگی۔کتنی جانفشانیوں سے صحیح حالات ذہنوں میں بٹھائے گئے ہوں گے۔کیا کچھ محنتیں اخلاقی حدود اور ضابطوں کو معاشرے میں عملی طور پر قائم کرنے پر صرف کی گئی ہوں گی اور

یہ عظیم سرمایہ ہمیں میراث میں مفت مل گیا ہے۔اس کو اگر ہم ترقی نہیں دے سکتے تو کم از کم ہمیں اسے برباد تو نہیں کرنا چاہیے۔ہمارا نظام تعلیم وتربیت، ہمارا تصور ثقافت، ہمارا لٹریچر ذرائع ابلاغ اور ٹی وی بحیثیت مجموعی جس رفتار سے اس سرمائے کی ناقدری کرنے والے اور اس کو برباد کرنے والے بے حیاء اور بے غیرت لوگ روز بروز زیادہ سے زیادہ پیدا کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز ہم اس کو کھو دیں گے اور اگر ایک دفعہ ہم نے اسے کھو دیا تو پھر از سر نو حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے اور خدا کرے کہ ہم اس کے آنے سے پہلے ہی ہم سنبھل جائیں۔

60 سال کی زندگی اور صرف پانچ سوال

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ حشر کے میدان میں ہر شخص سے پانچ سوال کئے جائیں گے اور جب تک وہ ان پانچ سوالوں کے جواب نہ دے لے گا، مجال نہیں کہ وہ اللہ کی بارگاہ سے قدم ہٹا سکے۔

(1) اپنی زندگی کن کاموں میں لگائی۔

(2) اپنی جوانی کو کن کاموں میں کھپایا۔

(3) مال و دولت کن ذرائع سے حاصل کیا۔

(4) مال و دولت کن کاموں میں خرچ کیا۔

(5) اور جو علم حاصل تھا اس پر کہاں تک عمل کیا۔

بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہم اور آپ حشر کے میدان میں کھڑے ہوں گے اور ان سوالوں کے جوابات پوچھے جا رہے ہوں گے۔کس قدر خوش نصیب ہے وہ شخص جو اس زندگی میں ان سوالوں کے صحیح جوابات تیار کر رہا ہے اور ان سوالوں کو سامنے رکھتے ہوئے شعور کی زندگی گزار رہا ہے۔زندگی آپ کو بھی ملی ہے، جوانی کی نعمت سے آپ بھی نوازے گئے ہیں، مال و دولت

کے آپ بھی مالک ہیں، مال آپ بھی خرچ کر رہے ہیں، آپ کو بھی بہت کچھ علم حاصل ہے اور آپ بھی عمل کر رہے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ آپ کیا جوابات تیار کر رہے ہیں اور کل کو اللہ کو خوش اور مطمئن کرنے کیلئے کیا کچھ کر رہے ہیں؟

مسئلہ آپ کی اپنی زندگی کا ہے، اس کا تعلق کسی اور سے نہیں، آپ سے اور صرف آپ سے ہے۔ آپ ہی اس کے ذمہ دار ہیں اور آپ ہی کو اپنے کیے کا اچھا یا برا انجام دیکھنا ہے۔ آپ اس پر سوچنے کی زحمت اٹھائیں یا نہ اٹھائیں آپ کی زندگی بہر حال ان سوالات کے جوابات تیار کر رہی ہے۔

سنجیدگی سے سوچیے کہ آپ کیا فیصلہ چاہتے ہیں۔۔۔ کل آپ دارالحساب میں ہوں گے اور عمل کی مہلت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکی ہوگی۔ (بشکریہ ماہنامہ "سوچنے کی باتیں")

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف و کرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد و اذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چار دیواری کے اندر احسن طریقے سے ہوسکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب و نظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو کر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اس میں غرق ہوجانے کی۔